رجب المرجب۔ رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ

اپریل۔ جون ۲۰۱۶ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۵ شمارہ ۲

رجب المرجب۔ رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ اپریل۔ جون ۲۰۱۶ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ ــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 240 روپے، فی شمارہ: 60 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

حقوقِ نسواں: 'بل' نہیں 'تحریک'!	حافظ عاطف وحید	3

اعتصامش کُن .....

وحدتِ ملّی کی اساس: قرآن مجید	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	6

حکمتِ نبویؐ

تعمیلِ حکم اور امیدِ رحمت کی ادائیں	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	11

تذکّر و تدبّر

مَلاكُ التأويل (۵)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	14

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید' مع صرفی ونحوی تشریح	افادات حافظ احمد یارؒ	29

حقیقتِ دین

ایمان اور فلسفہ ابتلاء وآزمائش	پروفیسر توقیر عالم فلاحی	41

فکر و نظر

وجودِ باری تعالیٰ: نظریہ ہائے علم الکلام کی روشنی میں (۳)	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر	53

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	ادارہ	76

بیانُ القرآن

96	Dr. Israr Ahmad	MESSAGE OF THE QURAN

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

حقوقِ نسواں: ’بل‘ نہیں ’تحریک‘!

کوئی سی بھی انسانی کاوش، چاہے وہ قانون سازی کی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، کبھی بھی بالکل بے عیب نہیں ہوسکتی۔ بے عیب تو صرف خدا کی ذات اور اُس کا کلام ہے، یا خدا کے مستند نمائندوں، یعنی انبیاء و رُسل علیہم السلام کا مستند فرمایا ہوا عیب سے بالاتر ہوتا ہے۔

تحفظِ نسواں کے قانون کا مسودہ اپنی موجودہ صورت میں عاقبت نااندیشی کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس قانون کے بنانے میں قانون سازی کے مروّجہ اصولوں سے انحراف بھی کیا گیا اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے سرکاری و ریاستی اہمیت کے ادارے کی مشاورت کو بھی غیر ضروری سمجھا گیا۔ یہ طریقہ کار ایک روایتی مسلم معاشرے میں، جس کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا گیا ہو، ایک ناقابلِ فہم معاملہ قرار پائے گا۔ لیکن ہمیں اصل تشویش اس بات پر نہیں ہے کہ اس قانون کو بنانے میں کن اہم اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہے، بلکہ اصل تشویش اس امر پر ہے کہ مذہبی طبقات نے اس قانون کی تردید میں نامناسب رویے کا اظہار کیا ہے۔ نامور مذہبی قائدین کی جانب منسوب اخباری بیانات سے عورتوں کے حقوق کے بارے میں متعصّبانہ سوچ کی بو آتی ہے۔ ’’زن مریدی‘‘ اور اس جیسی دیگر تہمتیں معتدل نفسیات کے حامل اَذہان پر ہتھوڑے بن کر برستی رہیں اور یہ رویہ اس تاثر کو اجاگر کرتا ہے کہ اسلام شاید گھریلو تشدد کی شکار خواتین کا حمایتی نہیں۔ ظاہر ہے یہ تاثر بے اصل ہے۔ اسلامی طرزِ معاشرت میں عورتوں کے حقوق دنیا کی کسی دوسری معاشرت سے زیادہ حفاظت شدہ ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرتی سیٹ اپ میں ان حقوق کی عملی ترویج ایسے ہی مفقود ہے جیسے نظامِ معیشت میں سے اسلام کی بنیادی عادلانہ تعلیمات مفقود ہیں۔

اسلام میں عورتوں کے مقام اور ان کے حقوق کے بارے میں آج تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جارہا ہے، لیکن بدقسمتی سے اس میں سے بیشتر بیان کی اہمیت ایک نظریے اور تھیوری سے زیادہ نہیں! گویا ان نظریات کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ عملی زندگی میں ہندوانہ رسم و رواج، وڈیرہ شاہی کی اَقدار اور مغربی معاشرت ہی کا دور دورہ ہے۔ عورت کو ایک کمتر مخلوق سمجھنا اور اسے شوہر ہی نہیں گھر بھر کی ’’ملازمہ‘‘ کا درجہ دینا ہمارے معاشرے کا من جملہ وطیرہ ہے۔ چنانچہ مرد اپنے حقوق کے حصول کے لیے عورت پر تشدد کو روا سمجھتا ہے، جبکہ عورت کے لیے اعلیٰ اخلاقی مرتبہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے حقوق سے ہمیشہ دستبرداری اختیار کیے رکھے۔ اس اندازِ فکر اور طریق کار کا سدِّباب بہرحال ضروری ہے۔ لیکن ’’تحفظِ حقوقِ نسواں بل‘‘ سے مطلوبہ نتائج کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اس کے لیے ایک ہمہ گیر ’’احترامِ نسواں تحریک‘‘ کی ضرورت ہے جو دینی اَقدار کے فروغ اور سماجی اداروں کی مؤثر شمولیت کے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کرسکتی۔

دینی لحاظ سے اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق میں کوئی فرق نہیں۔ مرد کا نیکی کرنے کا ثواب اور گناہ کا وبال اس کے لیے ہے۔ عورت کی نیکی کا اجر اور گناہ کی سزا اس کے لیے ہے۔ عورت دینی اور اخلاقی لحاظ سے مرد کے تابع نہیں' دونوں اپنی اپنی شخصیت کے خود ذمہ دار ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: ''میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو''۔ (آل عمران: ۱۹۵)۔ اسی طرح فرمایا گیا: ''مرد حصہ پائیں گے اس میں سے جو وہ کمائی (کسب) کریں گے' اور عورتیں حصہ پائیں گی اس میں سے جو وہ کمائی (کسب) کریں گی۔ اللہ سے اُس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔'' (النساء: ۳۲)

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ نیکی اور بدی کمانے میں عورت اور مرد بالکل آزاد ہیں۔ مرد کی کمائی سے عورت اور عورت کی کمائی سے مرد حصہ دار نہ ہوگا۔ اس آیت پر خصوصی توجہ کی اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں 'کسب' کے لفظ سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ یہ معاشی جِدّوجُہد کے لیے آیا ہے۔ گویا جیسے مرد کو معاشی میدان میں تگ ودو کی آزادی ہے' ویسے ہی عورت بھی ملازمت کرنے میں آزاد ہے۔ جاننا چاہیے کہ لفظ 'کسب' قرآن پاک میں کمائی کے لیے کم ہی آیا ہے' اکثر اس کا استعمال نیکی اور بدی کمانے کے مفہوم میں ہے۔ دُنیوی رزق کے لیے قرآن کی اصطلاح 'فضل' ہے 'کسب' نہیں۔

تاریخِ انسانی میں اسلام نے پہلی مرتبہ عورت کو مستقل قانونی تشخص دیا۔ اسے ذاتی حقِ ملکیت بھی حاصل ہے اور اس پر تصرّف کا اختیار بھی۔ عورت کی مختلف حیثیتوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات بہت واضح ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اپنے حق کے ساتھ ہی والدین کے حق کا ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس کی مزید تشریح یوں فرمائی: ایک شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں''۔ اُس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں''۔ اُس نے نے مکرر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں''۔ اُس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: ''تیرا باپ!'' گویا باپ کے مقابلے میں ماں کا حق کم از کم تین گنا زیادہ ہے۔

بیٹی کی حیثیت میں بھی عورت ذات کو نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بیٹی کا باپ ہونا باعث سعادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی' یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح ہوں گے جیسے میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں (ساتھ ساتھ) ہیں''۔ (مسلم) ایک دوسری روایت میں ہے: ''جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ ان کی اچھی طرح پرورش کرے' تو یہی لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔'' (مسلم)

یہی صورتِ حال عائلی نظام میں شوہر اور بیوی کے حوالے سے ہے۔ قانون میں شوہر کو بیوی پر قوّام (نگہباں' محافظ' حاکم' کفیل) بنایا گیا ہے۔ گویا اس لفظ کا صحیح مفہوم یوں ہوگا کہ وہ شخص جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو صحیح اور درست طور پر چلانے اور اس کی حفاظت ونگہداشت کرنے اور اس کی احتیاجات و ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ سورۃ النساء' آیت ۳۴ میں ارشادِ ربانی ہے: ''مرد عورتوں پر قوّام ہیں''۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی انتہائی تاکید فرمائی ہے۔ چند احادیث سے بات واضح ہو جاتی ہے:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا کُل کی کل برتنے کی چیز ہے اور اس دنیا کی بہترین متاع نیک عورت (بیوی) ہے۔'' (مسلم)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہو اور تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی عورتوں (بیویوں) کے حق میں بہترین ہوں۔'' (ترمذی)

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(لوگو! جان لو کہ) تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ اور (جان لو کہ) تم میں سے اپنے گھر والوں سے سب سے بہتر حسنِ سلوک کرنے والا میں خود ہوں۔'' (ترمذی)

یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو گھر میں مرد کی حاکمیت کا تو خوب احساس رہتا ہے مگر عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کو وہ اضافی نیکی سمجھتے ہیں۔ خاکم بدہن' یہ چیز ہماری پکڑ کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ سیرتِ مطہرہ سے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ذاتی حوالے سے کسی زوجہ محترمہ کی سرزنش یا ڈانٹ ڈپٹ بھی کی ہو' تشدد کا کیا سوال ہے۔ سیرت کا یہ پہلو اختیار کرنا تو درکنار ہم ادھر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ حدیثِ نبویؐ ہے: ''مرد اپنے اہل وعیال پر حکمران اور نگران ہے اور وہ اپنی رعیت میں اپنے عمل پر اللہ کے سامنے جواب دہ ہے''۔ اسی طرح مشہور حدیث ہے: ''تم میں سے ہر ایک (اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں) راعی (نگران ونگہبان) ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں (اللہ تعالیٰ کے ہاں) جواب دہ ہے''۔ گھریلو امور میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو ایک گونہ مزاجی مناسبت دی ہے۔ انہیں گھر کے انتظام و انصرام کی قابلیت عطا فرمائی ہے۔ کسبِ معاش اگر خاوند کی ذمہ داری ہے تو اس کے گھر میں مناسب تنظیم بیوی کے ذمہ ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ''عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمران ہے اور وہ اپنی حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔'' (بخاری)

یہ خالق کائنات کی کمال حکمت ہے کہ مرد میں اگر فاعل اور فعالیت کی صلاحیت رکھی ہے تو عورت کو بھی منفعل وانفعال کی اہلیتوں سے نوازا ہے۔ دونوں اس نظامِ دنیا کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ اب اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے دائرۂ کار اور حدودِ عمل میں بے جا مداخلت کریں گے تو تمدن میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوگا۔ اسی کے مہلک نتائج انسان نے پہلے بھی بھگتے ہیں اور اب بھی بھگت رہا ہے۔ ایسے مَردوں اور عورتوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے لعنت فرمائی ہے جو ایک دوسرے کی نقالی کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت کی جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں (سنن ابی داؤد)۔ اسی سنن میں ایک دوسری روایت ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد پر لعنت کی ہے جو عورت کا لباس پہنے اور اس عورت پر لعنت کی ہے جو مرد کا لباس پہنے۔''

اسلامی معاشرت میں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے افراد' خاندان' برادری' قبیلہ' نظامِ حسبہ' عدالت اور ریاست سبھی درجہ بدرجہ ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ موجودہ بگاڑ کو مجوزہ قانون سے درست کرنا محض خام خیالی ہے' اس کے لیے وسیع البنیاد تحریک ناگزیر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ہم عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے کے لیے تیار ہیں؟ یا یہ محض ایک وقتی بخار ہے جو اپنے مغربی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے چڑھایا گیا ہے؟

❁❁❁

وحدتِ ملّی کی اساس: قرآن مجید

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

حَامِدًا وَمُصَلِّیا و مستعیذًا ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران:۱۰۳)

انسانی غور وفکر کے نتیجے میں اب یہ بات ایک سائنسی نظریہ کی صورت میں سامنے آ چکی ہے کہ عالمِ موجودات اوراس نظامِ کائنات میں ہر چھوٹی بڑی شے کا وجود اُس کے مرکز سے وابستہ ہے۔ذرّہ (Atom) کا وجود ایک مرکز (Nuclear) سے وابستہ ہے۔زمین اوراس پر رہنے والی مخلوقات کی زندگی مرکزی کشش ثقل کے سہارے قائم ہے۔نظامِ شمسی ایک مرکز کی بناء پر استوار ہے اوراسی طرح بات آگے کہکشاں تک پہنچتی ہے۔

ذرہ سے لے کر نظام ہائے کہکشاں (Galactic System) تک ہر جگہ اپنے اپنے مرکز کے گرد طواف کا ایک منظر پایا جاتا ہے۔مرکز کے ٹوٹ جانے یا مرکز سے بے تعلق ہو جانے کے نتیجے میں تباہی اور بربادی ظہور میں آتی ہے۔

چیست وحدت؟ جز وجودِ مرکزے زندہ ہر شے در حدودِ مرکزے!!
ذاتِ شے بر ذرّہ باشد منقسم ذرّہ ہا را مرکزے دارد بہم
ذرّہ ذرّہ سوئے مرکز می رود آیون آیون[1] گرد یک مرکز دود
ثابت و سیّارگان را مرکز است قطب را و کہکشاں را مرکز است
ہر یکے بینی بعشقے در طواف!! کے کند از مرکز خود انحراف
ہر نظامے را ست مرکز در جہاں مرکزے دارد ہم این کون و مکان
گر کسے از مرکزش رو تافتے نامِ خود ہم گم زہستی یافتے
ہر کہ دور از محورش مائل شود!! چوں شہابے ہستی اش زائل شود!

(مثنوی صدائی)

جس طرح عالم حسی وطبیعی میں اشیاء کا وجود مختلف درجات میں کسی نہ کسی مرکز سے مربوط ہے' اسی طرح اشخاص واقوام کا معنوی وجود بھی ہمیشہ کسی مرکز سے وابستہ ہوتا ہے۔

یہ معنوی مرکز ہی اس کی بقاء اوراس کی تعمیر وارتقاء کے لیے ایک مضبوط اساس مہیا کرتا ہے۔اقوام وملل میں اسی مرکز سے وابستگی کے باعث ایک احساسِ یکجہتی پیدا ہوتا ہے۔اور یہی احساسِ یکجہتی یا اخوت واتحاد ایک ملت یا قوم کو دوسری ملتوں اور قوموں سے ممتاز کرتا ہے۔

(۱) مراد ہے آئیونک تھیوری (Ionic Theory)

اسلامی نقطہ نظر سے تمام انسان دو ملّتوں میں منقسم ہیں۔ یعنی اسلام کا نظریہ ملّت درحقیقت دوقومی نظریہ ہے۔ ایک طرف ملّتِ اسلامیہ اور دوسری طرف الکُفر مِلَّۃٌ وَاحِدۃ ——— عجیب بات ہے کہ آج مسلمانانِ عالم یا کم ازکم ان کی خودساختہ قیادتیں وقت کے شدید ترین انتباہات کے باوجود اپنے آپ کو ایک اور صرف ایک ملت سمجھنے سے قاصر ہیں' یا کم ازکم وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں نظر آتے۔ دوسری طرف وہ ''ملّتِ کفر'' کو ملّتِ اسلامیہ کے مقابل عداوتِ مسلم پر متحد و متفق ایک ہی ملت سمجھنے کی بجائے کسی نہ کسی ملتِ کافرہ سے ''اُمیدِ غم گساری'' رکھتے ہیں۔ کوئی ماسکو کے سہارے زندگی کی تلاش میں ہے اور کوئی واشنگٹن کی مہربانی کو اپنے لیے درازیٔ عمر کا بہانہ خیال کیے ہوئے ہے۔ کوئی ایک سپر پاور کے دروازے پر حاضر ہے تو کوئی دوسری سپر پاور کی دہلیز پر۔ اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ مسلمان تو اپنی وحدت اور کفر کی وحدت کی تصور سے ناآشنا نظر آتا ہے' مگر غیر مسلم یا ''ملت ہائے کفر'' تمام مسلمانوں کو ایک ہی ملت سمجھ کر اسے معدوم کرنے یا محکوم بنانے کی مساعی میں ایک متفقہ پروگرام پر عمل پیرا نظر آتی ہیں۔

ہنود و یہود اور روس و امریکہ سب عداوتِ مسلم پر متحد ہیں —— لبنان ہو یا افغانستان' صومالیہ ہو یا ہندوستان' اری ٹیریا ہو یا فلپائن' ہر جگہ خونِ مسلم کی ارزانی دیکھئے! اور یہی نہیں کہ صرف غیر ہی ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں' مسلمان خود بھی وحدتِ ملّت کے تصور کو پس پشت پھینک کر اپنے اپنے سیاسی قبلہ سے وفاداری کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہیں —— ایران' عراق اور صحراء میں کون کس کو مار رہا ہے؟ اور کس کے لیے؟ آج کتنے لاکھ بے خانماں جلاوطن مسلمان دنیا کے مختلف ملکوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں —— یا مہاجر کیمپوں میں اپنے بڑوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝۱۶﴾ (الحدید)

''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور اُس (قرآن) کے آگے کہ جو حق میں سے نازل ہو چکا ہے' اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی تو جب ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آج اگر ملّتِ اسلامیہ کی سیاسی وحدت وطن' نسل' رنگ' زبان وغیرہ کے مراکز میں بٹ کر رہ گئی ہے تو ان کی دینی وحدت بھی چند مخصوص کلامی اختلافات اور فقہی مذاہب کو ہی اساسِ وحدت سمجھ لینے کی بنا پر فرقوں اور مسالک میں تقسیم ہو گئی ہے۔ اور سب آپس میں دست و گریباں ہیں —— سیاسی معاملات ہوں یا دینی توجیہات ہر جگہ اختلافات ''رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ'' سے گزر کر ''بَغْیًا بَیْنَهُمْ'' کے نشانِ خطرہ (Danger Point) سے متجاوز ہوتے نظر آتے ہیں۔

مسلمان غالباً اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی وحدتِ ملت کے تصور سے اتنا منحرف اور اس کا اتنا محتاج کبھی بھی نہیں ہوا جتنا آج ہے۔

ملی وحدت کے لیے اور اتحاد کے لیے ایک مضبوط اساس یا ایک ایسے قومی مرکز کی ضرورت ہوتی ہے جس میں نہ صرف تمام اجزائے ملّت کو مرکزِ ملّت کی طرف کھینچنے کی زبردست قوت موجود ہو بلکہ جو منتشر اور متفرق کرنے والی تمام قوتوں پر غالب بھی آ سکے۔

آج یہ بات کرنا تو کوئی انکشاف نہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کی اساس وطن، نسل و رنگ، زبان یا کسی اور مشترکہ وقتی مفاد پر نہیں ہے، ملتِ اسلامیہ کی اساس دینِ اسلام ہے۔ بقول اقبال ؏

قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

مگر خود دین اسلام کی صحیح پہچان اور شناخت اس کے اپنے مرکز کے حوالے سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ بقول مولانا رومؒ ؎

دیں بگیرد بدعتے بدعت شود
کفر گیرد کاملے ملت شود

ملّت کی اساس دین اور دین کی اساس کتاب وسنت ہے۔ کتاب وسنت میں ہی ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب، ایک قبلہ اور ایک امت کا تصور موجود اور شامل ہے، بلکہ یہی ایمان کا مقصود ہے۔

پھر کتاب وسنت میں بھی سنت کی حیثیت کتاب کے اولین اور معتبر ترین شارح کی ہے، جس کے بغیر فہمِ قرآن کی کوئی کوشش گمراہی سے اور جس کے بغیر ذاتِ رسول ﷺ سے عشق و وفاداری کا کوئی ادعا امکانِ کذب سے محفوظ نہیں ہے۔

اِن معنوں میں دین کی اصل اساس قرآن کریم ہے اور اسی کو وحدتِ ملتِ اسلامیہ کی صحیح ترین اور مضبوط ترین اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

وحدتِ ملی کے ساتھ قرآن مجید کے اس اساسی اور بنیادی تعلق کی مزید وضاحت خود قرآن کریم کی بعض آیات سے ہوتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور باہم نا اتفاقی میں نہ پڑو'' میں ''حبل اللّٰه'' کی تفسیر مفسرین نے قرآن، اسلام، عہد اللہ، جماعت، اطاعت اور توحید سے کی ہے۔ تاہم اکثر نے اس سے کتاب اللہ یا قرآن کریم ہی مراد لیا ہے۔

(i) ابن جریر نے کتاب اللہ کے معنوں کی تائید میں پانچ مختلف طرق اور اسناد سے روایت بیان کی ہے۔

(ii) حافظ ابن کثیر نے حضرت ابوسعید خدریؓ کے حوالے سے ''حبل اللہ'' سے مراد ''قرآن مجید'' لیا ہے۔

هو حبل اللّٰه الممدود من السماء الى الارض ..... كالحبل الذى يتمسك به خشية السقوط۔

احمد محمد شاکر نے ابن کثیر کی تلخیص میں اس روایت کو سنداً ضعیف مگر معناً صحیح اور ثابت قرار دیا ہے اور

شواہد کے طور پر کچھ اور روایات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ازاں جملہ صحیح مسلم (کتاب فضائل الصحابة) کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے:

((اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمْ ثَقَلَیْنِ، اَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ، مَنِ اتَّبَعَهٗ كَانَ عَلَى الْهُدٰى وَمَنْ تَرَكَهٗ كَانَ عَلٰى ضَلَالَةٍ))

''میں تمہارے مابین دو بھاری (نہایت اہم) چیزیں چھوڑ رہا ہوں' ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے اور وہی اللہ کی رسی ہے۔ جس کسی نے اس کی پیروی کی وہ ہدایت پر ہوگا اور جس نے اسے چھوڑ دیا وہ گمراہی پر ہوگا۔''

شیعہ مفسر طبرسی نے چار مختلف روایات کے ذریعے ''حبل اللّٰہ'' سے قرآن کریم مراد لیے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اپنے مسلک کی بناء پر اس نے ''اھل بیت'' کو بھی اس میں شمار کر ڈالا ہے۔

تفسیر ''المنار'' میں ''حبل اللّٰہ'' کی تفسیر قرآن مجید سے کرنے کو قولِ مختار قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے بھی کہ باقی سب معانی خود بخود اس میں شامل ہیں۔ صاحب المنار مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فهو (یعنی اللّٰه) اوجب علینا ان نجعل اجتماعنا و وحدتنا بکتابه علیه نجتمع وبه نتحد لا بجنسیات نتبعها ولا بمذاهب نبتدعها ولا بموا صفات نصنعها ولا بسیاسات نخترعها، ثم نهانا (اللّٰه) من التفرق والانفصام بعد هذا الایضاح والاعتصام لما فی التفرق من زوال الوحدة''

یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ آیت اسلام کے نظریہ وحدت ملت کے ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں کو شامل ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا.....اور.....لَا تَفَرَّقُوْا

(۲) اتحاد و وحدتِ ملت کے لیے تالیف بین القلوب نہایت ضروری ہے۔ سورۂ آل عمران اور سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے اعداء کے دلوں کو باہم جوڑنے کے اس عمل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(i) ﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ﴾ (آل عمران:۱۰۳)

''جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کے اندر الفت پیدا کر دی پس تم اللہ کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔''

(ii) ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ﴾ (الانفال:۶۳)

''وہی تو ہے جس نے (اے نبی ﷺ!) آپ کی مدد کی ہے اپنی نصرت سے اور اہل ایمان کے ذریعے سے۔ اور ان (اہل ایمان) کے دلوں میں اُس نے الفت پیدا کر دی۔ اگر آپؐ زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تو ان کے دلوں میں یہ الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے' لیکن یہ تو اللہ نے ان کے مابین ایسی الفت پیدا کر دی۔''

سورۂ آل عمران ہی کی اس آیت سے پہلے ایک آیت میں اعتصام باللہ (اللہ کو مضبوط پکڑنا) کو حصولِ ہدایت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے ﴿وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ سے چمٹ جائے اُس کو تو ہدایت ہو گئی صراطِ مستقیم کی طرف''۔ اور آگے اسی اعتصام باللہ کا ہی حکم ﴿وَاعْتَصِمُوْا

بِحَبْلِ اللّٰہِ﴾ کے الفاظ میں دیا ہے۔

پوری ملت میں تالیف بین القلوب یا دل جوڑنے کا یہ کام آج بھی کتاب اللہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

فرقہ وارانہ باتوں سے کسی ایک فرقے میں شاید تالیف بین القلوب کا کام لیا جا سکے اور وہ بھی منفی انداز میں۔ مثبت اور تعمیری انداز میں ملت گیر سطح پر تالیف بین القلوب قرآن کے نام پر اور اسلام کے نام پر ہی ممکن ہے اور ان کا مظہر اصل قرآن کریم ہی ہے اور وہی ''سبیل اقوم'' کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

(۳) قرآن کریم کے بارے میں قرآن کریم میں ہی وعدۂ حفاظتِ الٰہی مذکور ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹﴾ (الحجر)

''بے شک ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اساسِ قرآنی پر مبنی وحدت ہی محفوظ اور پائیدار وحدت ہوگی۔ اس لیے کہ اس اتحاد یا وحدت کی بنیاد کسی وقتی مصلحت یا کسی منفی مفاد پر نہیں ہوگی۔

ہم جانتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کو بھی اپنی اغراض و ہوائے نفس کے تحت تحریفِ معنوی کا نشانہ بنایا ہے۔ خدا و جبریل و مصطفیٰ (ﷺ) کو دم بخود کر دینے والی تاویلات بھی کی گئی ہیں۔ خود بدلنے کی بجائے قرآن کو بدل دینے والے فقیہانِ حرم بھی موجود ہیں:

اے بسا عالم ز قرآں حرف جوست
دین حق ہفتاد و دو فرقہ ازوست!

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے نہ صرف الفاظ و حروف میں کوئی ادنیٰ تغیر واقع نہیں ہوا' بلکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے جس طرح سمجھا اور نافذ کیا اور جس طرح اس پر خود عمل کیا اور دوسروں سے عمل کرایا اس کی تمام تر تفصیلات کا ریکارڈ بھی موجود ہے جو اتباعِ شہوات پر مبنی تمام آراء وتاویلات کے لیے پڑتال اور احتساب کا کام دیتا ہے۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی لفظاً اور معناً حفاظت اپنے ذمہ لی ہے' اس لیے قرآن ہی وحدتِ ملت کی سب سے محفوظ اور محکم ترین اساس ہے۔ قرآن کو چھوڑ کر کسی اور شے پر ملت استوار کرنے کی کوشش کا انجام ﴿فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ﴾ (التوبۃ:۱۰۹) ہی ہو سکتا ہے۔

[یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن کی دس سالہ تقریب کے ضمن میں ''اصلاحِ معاشرہ اور قرآن حکیم'' کے موضوع پر ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء کو جناح ہال لاہور میں پیش کیا گیا۔]

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

تعمیلِ حکم اور امیدِ رحمت کی ادائیں

مدرّس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:

((اِنَّ رَجُلَیْنِ مِمَّنْ دَخَلَ النَّارَ اِشْتَدَّ صِیَاحُهُمَا، فَقَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ: اَخْرِجُوْهُمَا، فَلَمَّا اُخْرِجَا قَالَ لَهُمَا : لِاَیِّ شَیْءٍ اشْتَدَّ صِیَاحُکُمَا؟ قَالَا : فَعَلْنَا ذٰلِكَ لِتَرْحَمَنَا' قَالَ: اِنَّ رَحْمَتِیْ لَکُمَا اَنْ تَنْطَلِقَا فَتُلْقِیَا اَنْفُسَکُمَا حَیْثُ کُنْتُمَا مِنَ النَّارِ، فَیَنْطَلِقَانِ ، فَیُلْقِیْ اَحَدُهُمَا نَفْسَهٗ، فَیَجْعَلُهَا عَلَیْهِ بَرْدًا وَسَلَامًا، وَیَقُوْمُ الْآخَرُ، فَلَا یُلْقِیْ نَفْسَهٗ، فَیَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ: مَا مَنَعَكَ اَنْ تُلْقِیَ نَفْسَكَ کَمَا اَلْقٰی صَاحِبُكَ نَفْسَهٗ؟ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ لَّا تُعِیْدَنِیْ فِیْهَا بَعْدَ مَا اَخْرَجْتَنِیْ، فَیَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ : لَكَ رَجَاؤُكَ ، فَیَدْخُلَانِ جَمِیْعًا الْجَنَّةَ بِرَحْمَةِ اللّٰهِ)) (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دوزخ کے اندر جانے والوں میں دو شخص ہوں گے کہ ان کی چیخ و پکار بڑی زور کی ہوگی۔ پس حق تعالیٰ فرمائے گا کہ ان کو نکال کر لاؤ۔ انہیں نکالا جائے گا تو ان سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا: اتنا کیوں چیخ رہے ہو؟ عرض کریں گے: اس لیے تا کہ آپ ہم پر رحم فرمائیں۔ ارشاد ہوگا: اچھا' میرا رحم تمہارے ساتھ یہی ہے کہ جاؤ اور دوزخ میں جہاں تم پڑے تھے وہیں اپنے آپ کو ڈال دو۔ چنانچہ دونوں چلیں گے اور ایک تو اپنے آپ کو دوزخ میں ڈال دے گا اور حق تعالیٰ اس کو اس پر ٹھنڈا اور سلامتی بخش بنا دے گا۔ جب کہ دوسرا کھڑا رہے گا اور اپنے آپ کو دوزخ میں نہ ڈالے گا۔ پس حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا: تُو نے اپنے آپ کو (آگ میں) کیوں نہ ڈالا جیسا کہ تیرے ساتھی نے اپنے آپ کو ڈال دیا؟ وہ عرض کرے گا کہ اے رب! مجھے یہ اُمید تھی کہ آپ (جب فضل فرما کر) مجھے اس سے نکال چکے تو اب اس میں واپس نہ فرمائیں گے۔ پس حق تعالیٰ فرمائے گا: اچھا تیری امید بحال! چنانچہ دونوں اللہ کی رحمت سے ایک ساتھ جنت میں چلیں جائیں گے (کہ ایک کی تعمیلِ حکم کا انداز پسند آیا اور دوسرے کی رجاءِ رحمت کی ادا بھائی کہ رحمتِ حق بہانہ می جوید)۔''

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو اشخاص کا ذکر کرتے ہیں جن کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو وہ زور زور سے چیخیں چلّائیں گے۔ اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ دونوں کو وہاں سے نکال لاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھیں گے کہ تم اس قدر کیوں چیخ چلّا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: پروردگار! ہم چیخ رہے تھے تا کہ آپ ہم پر رحم کریں۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تمہارے لیے تو میرا رحم یہی ہے کہ تم دوزخ میں جہاں پڑے تھے وہیں اپنے آپ کو ڈال دو۔

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة جهنم' باب ما جاء ان للنار نفسین وما ذکر من یخرج من النار من اهل التوحید۔

ان میں سے ایک تو چل کر اپنے آپ کو پھر دوزخ میں ڈال دے گا۔ حق تعالیٰ اس کے لیے اسے ٹھنڈا اور سلامتی بنا دے گا۔ مگر دوسرا وہیں کھڑا رہے گا اور اپنے آپ کو دوزخ میں نہ ڈالے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: تیرے ساتھی نے تو اپنے آپ کو دوزخ میں ڈال دیا' تم کیوں جہنم میں نہ گئے اور کھڑے رہے؟ وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں امید کرتا تھا کہ آپ مجھے دوزخ سے نکال چکے ہیں اور اب پھر اس میں واپس نہ ڈالیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تیری امید پوری کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ دونوں جنت میں چلے جائیں گے۔ ایک اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا تعمیل حکم کا انداز پسند آ گیا اور دوسرا اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید تھی۔

اللہ تعالیٰ کی ہر صفت لامحدود ہے۔ اسی طرح اس کی صفت رحمت کی بھی کوئی حد نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ﴾ (الاعراف:۱۵۶) ''بے شک میری رحمت ہر شے سے وسیع ہے''۔ اگر وہ کسی جہنمی پر رحم کر کے اسے جنت میں پہنچا دے تو اس کا اختیار ہے۔ لیکن وہ کسی جنتی کو جہنم میں نہ ڈالے گا' کیونکہ وہ مائل بہ کرم ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ﴾ (الانعام:۱۶۰) ''جو کوئی ایک بھلائی لے کر آئے گا اس کو اس طرح کی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔'' جبکہ ایک گناہ کرنے والے کا ایک ہی گناہ لکھا جائے گا یا اس کو بھی اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ﴿۳۰﴾﴾ (الشوریٰ) ''جو پڑتی ہے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہ تو معاف بھی کر دیتا ہے۔''

حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اسی وقت اس کی ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور اگر وہ نیکی کر لے تو اسے دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اگر برائی کا ارادہ کرے تو اس کی نیت پر برائی نہیں لکھی جاتی۔ جب وہ برائی کر لے تو صرف ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے' بلکہ اگر کوئی برائی کا ارادہ کرے اور پھر اس سے باز رہے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر مہربان ہے' وہ تو مائل بہ کرم ہے۔ اس کی رحمت تو کوئی چھوٹا موٹا بہانہ چاہتی ہے تا کہ گنہگار کا گناہ معاف کر دے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :

رحمتِ حق بہا نمی جوید رحمتِ حق بہانہ می جوید!

اس حدیث میں دوزخ میں ڈالے گئے دو شخصوں کی چیخ و پکار کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو دوزخ سے باہر نکالتا ہے اور ان کی چیخ و پکار کا سبب پوچھتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں اُسی جگہ جانے کو کہتا ہے۔ ایک تو چلا جاتا ہے جبکہ دوسرا رحمت کی امید پر کھڑا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو جہنم میں واپس نہیں بھیجتا۔ ایک کی تعمیل ارشاد اللہ کو پسند آ گئی اور دوسرے نے رحمت کی امید لگائی تو اللہ نے اس کی امید پوری کر دی۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ میں گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ بندے کے بہت سے گناہ تو معاف بھی کر دیتا ہے۔ سورۂ فاطر میں ارشاد ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی برائیوں پر پکڑتا تو زمین کی پیٹھ پر کوئی بھی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑتا۔ (آیت ۴۵) کیونکہ انسان تو خطا کا پتلا ہے' اس سے غلطی اور گناہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کی اکثر خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے' اگر ہر غلطی پر گرفت ہو جائے تو کوئی متنفّس نہیں بچ سکتا۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک گنہگار شخص سفر میں تھا۔ اسے سخت پیاس لگی۔ چلتے چلتے اسے ایک کنواں مل

گیا جس کا پانی کافی نیچے تھا۔ وہ اس کے اندر نیچے اترا اور پانی پی کر باہر نکلا۔ باہر آ کر اس نے دیکھا کہ ایک کُتّا پیاس کی شدت کی وجہ سے کیچڑ کھا رہا ہے۔ اسے کتے پر رحم آیا' وہ دوبارہ کنویں میں اترا اور اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر موزے کو دانتوں سے پکڑ لیا۔ کنویں سے نکل کر اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی اس رحم دلی اور محنت کی قدر فرمائی اور اس شخص کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔ (ماخوذ از بخاری و مسلم)

خوفِ خدا وہ جذبہ ہے کہ اللہ کی رحمت کو قریب کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾﴾ (الرحمٰن) ''اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لیے دو جنتیں ہیں۔'' حدیث میں ایسے کئی واقعات مذکور ہیں کہ کسی انسان کا کوئی فعل جو اُس نے خدا کے خوف سے انجام دیا اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو گیا اور اسے جنت مل گئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''ایک شخص نے اپنے نفس پر بڑی زیادتی کی (اور بڑا ظلم کیا' یعنی غفلت سے اللہ کی نافرمانی والی زندگی گزارتا رہا) جب اُس کی موت کا وقت آیا تو (اپنی پچھلی زندگی کو یاد کر کے اس پر اللہ کے خوف کا بہت زیادہ غلبہ ہوا' اور آخرت کے برے انجام سے وہ بہت ڈرا' یہاں تک کہ) اُس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو تم مجھے جلا کر راکھ کر دینا' پھر تم میری اس راکھ میں سے آدھی تو کہیں خشکی میں بکھیر دینا' اور آدھی کہیں دریا میں بہا دینا (تاکہ میرا کہیں پتہ نشان بھی نہ رہے' اور میں جزا و سزا کے لیے دوبارہ زندہ نہ کیا جاؤں۔ اس نے کہا کہ میں ایسا گناہگار ہوں کہ) اللہ کی قسم! اگر خدا نے مجھے پکڑ لیا' تو وہ مجھے ایسا سخت عذاب دے گا جو دنیا جہان میں کسی کو بھی نہ دے گا۔ اس کے بعد جب وہ مر گیا' تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا (جلا کر اُس کی راکھ کو کچھ ہوا میں اڑا دیا' اور کچھ دریا میں بہا دیا)۔ پھر اللہ کے حکم سے خشکی اور تری سے اس کے اجزاء جمع ہوئے (اور اس کو دوبارہ زندہ کیا گیا) پھر اس سے پوچھا گیا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا: اے میرے مالک! تو خوب جانتا ہے کہ تیرے ڈر سے ہی میں نے ایسا کیا تھا۔ (رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ نے اس بندہ کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔'' (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

پہلے زمانے کا یہ شخص خدا کی شان اور صفات سے ناواقف تھا اور نیک بھی نہ تھا۔ لیکن موت سے پہلے اس پر خوفِ خدا کی کیفیت طاری ہو گئی' وہ اپنے گناہوں کو یاد کر کے اللہ کی گرفت سے بہت ڈرا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو کہا کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو جلا دینا اور میری راکھ کو خشکی اور دریا میں بکھیر دینا' تاکہ میرے زندہ ہونے کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ بیٹوں نے ایسے ہی کیا۔ جب وہ اللہ کے حضور کھڑا ہوا تو اس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسے کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ اے اللہ تیرے ڈر سے۔ اللہ تعالیٰ کو خوفِ خدا سے یہ جاہلانہ غلطی پسند آ گئی اور یہ اس کی بخشش کا سبب بن گئی۔ حدیث کی کتابوں میں اور بھی کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی شخص محض خدا کے خوف کے ایک واقعے کے سبب بخش دیا گیا۔

اس حدیث میں مذکور ایک شخص کا خوفِ خدا یہ تھا کہ اس نے اللہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور جہنم کی طرف چل دیا۔ دوسرا رحمت کی امید پر کھڑا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو بخش دیا۔ پہلے نے حکم الٰہی کی تعمیل کی جو اللہ کو پسند آ گئی۔ دوسرے نے رحمت کی امید لگائی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی۔ چنانچہ دونوں کو جہنم سے نکال لیا گیا۔ ❁

مَلاكُ التأوِيل

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورة البقرة

(۳۰) آیت ۱۶۴:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا.....﴾

''بے شک (نشانیاں ہیں عقلمند لوگوں کے لیے) زمین وآسمان کی پیدائش میں' رات دن کے آنے جانے میں' کشتی کے سمندر میں چلنے میں ان چیزوں کے ساتھ جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے اتارا اور پھر اس سے اس زمین کو زندہ کیا جو مردہ ہو چکی تھی.....''

اور سورۃ العنکبوت کی آیت ۶۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ﴾

''اور اگر تم ان سے پوچھو' وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی کو اتارا اور پھر مردہ زمین کو اس سے زندہ کیا تو وہ کہیں گے: اللہ!''

اور سورۃ الجاثیہ کی آیت ۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا.....﴾

''(اور نشانیاں ہیں) رات دن کے آنے جانے میں' اور اس رزق میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور پھر مردہ زمین کو اس سے زندہ کیا.....''

یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) آیت العنکبوت میں ''بَعْدَ مَوْتِهَا'' سے پہلے ''مِنْ'' کا اضافہ ہے جو باقی دو آیات میں نہیں ہے؟

(۲) آیت الجاثیہ میں ''مَاء'' کی جگہ آسمان سے اترنے والی چیز کو ''رِزْقٍ'' کہا گیا اور باقی دونوں آیات میں ''مَاء'' سے تعبیر کیا گیا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ آیت العنکبوت میں ''مِنْ'' کا اضافہ تاکید بیان کے لیے ہے۔ اس لفظ سے

قبل آیت میں ''نزّل'' کا لفظ آیا ہے اور ''نزَّل'' باب تفعیل میں سے ہے جس میں مبالغہ اور کثرت پائی جاتی ہے' چنانچہ اس کی مناسبت سے ''مِنْ'' کا اضافہ کر دیا گیا' لیکن باقی دونوں آیات میں لفظ ''اَنْزَلَ'' لایا گیا ہے جس کے مفہوم میں تاکید نہیں پائی جاتی اور نہ ہی ان دونوں آیات میں ایسی کوئی زائد بات کہی گئی ہے جس کے بموجب ''مِنْ'' کا اضافہ کیا جاتا۔ اس لیے العنکبوت میں ''مِنْ'' کا ہونا اور باقی دو آیات میں ''مِنْ'' کا نہ ہونا ہی سیاق و سباق کے ساتھ مناسب تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآنی ترتیب کے لحاظ سے سورۃ الجاثیہ اخیر قرآن میں آ رہی ہے' اس لیے مناسب تھا کہ جو بات پہلے عمومی طور پر بیان کی گئی تھی اس کا بیان کر دیا جاتا۔

سورۃ النحل (آیت ۱۰) میں آسمان سے پانی اتارے جانے کا تذکرہ ہے اور پھر اس سے اگلی آیت (نمبر ۱۱) میں ارشاد فرمایا:

﴿يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ﴾

''پھر اس (پانی) سے تمہارے لیے اُگاتا ہے کھیتی کو' زیتون' کھجور اور انگور کو اور تمام پھلوں کو۔''

اور سورۂ قٓ کی آیات (۹ تا ۱۱) میں ارشاد فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ﴾

''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا' پھر اس سے اُگائے باغات' کٹی جانے والی غلے کی فصلیں' بلند و بالا کھجور کے درخت تہ بہ تہ خوشے والے' بندوں کی روزی کے لیے' اور اسی (پانی) سے ہم زندہ کر دیتے ہیں مردہ زمین کو۔''

اور یوں سورۃ الجاثیہ میں واضح کر دیا کہ آسمان سے اُترنے والا پانی دراصل تمہارے لیے رزق مہیا کرتا ہے یا یہ کہ وہ رزق کا سبب بنتا ہے۔ اور اس طرح ''پانی سے کیا مراد ہے'' اس کی وضاحت ہو گئی' جیسے کہ سورۃ الذاریات (آیت ۲۲) میں بھی فرمایا:

﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

''اور آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ تمام چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

(۳۱) آیت ۱۷۰ :

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ﴾

''اور جب ان سے کہا گیا کہ پیروی کرو اس چیز کی جسے اللہ نے نازل کیا ہے تو انہوں نے کہا: لیکن ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے۔''

اور سورۃ لقمان کی آیت ۲۱:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ﴾

سوال یہ ہے کہ دونوں آیتوں کا مطلب بالکل ایک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی آیت میں ''اَلْفَيْنَا''

اور دوسری آیت میں ''وَجَدْنَا'' کا لفظ آیا ہے۔ تو یہ فرق کیوں واقع ہوا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ ''اَلْفٰی'' وَجَدَ کے معنی میں آتا ہے' جیسے: ''وَجدتُ الضَّالَّةَ'' میں نے گمشدہ چیز کو پا لیا۔ اور اس صورت میں صرف ایک لفظ تک متعدی ہوسکتا ہے۔

لیکن ''وَجَدَ'' ''عَلِمَ'' کے معنوں میں بھی آتا ہے کہ جو دو لفظوں تک متعدی ہوسکتا ہے' اس کے مقابلے میں ''اَلْفٰی'' وَجَدَ (بمعنی عَلِمَ) کی طرح دو لفظوں تک متعدی نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ کہا جاتا ہے: اَلْفَیْتُ زَیْدًا عَالِمًا (میں نے زید کو عالم پایا) لیکن یہاں ''عالِمًا'' مفعول ثانی نہیں ہے بلکہ حال کی بنا پر منصوب ہے اور اسی لیے وہ ہمیشہ نکرہ ہی آیا کرتا ہے۔

''وَجَد'' اس لحاظ سے دو معنوں میں اشتراک رکھتا ہے۔ بمعنی عِلْم' یعنی کسی چیز کو جان لینا' اور بمعنی وجدان یعنی کسی چیز کو پالینا' جیسا کہ اوپر کی مثال میں مذکور ہوا: ''وَجدتُ الضَّالَّةَ'' میں نے گمشدہ چیز کو پالیا۔

اب دیکھئے کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت سے پہلے کہا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۫ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۸)

''اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور طیب ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔''

اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾

''بے شک وہ تمہیں برائی کا اور فاحشہ کا حکم دیتا ہے اور اس بات کا کہ تم اللہ کے بارے میں وہ کچھ کہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔''

شیطان کے قدم اور شیطان کے احکامات گمراہ کن خواہشات کا نام ہے جن کا علم سے دور کا بھی واسطہ نہیں' گویا یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ شیطان ہے جو انہیں ان باتوں کا حکم دیتا ہے اور اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہنے پر اُکساتا ہے جو وہ نہیں جانتے' اور حاصل کلام یہ ہوا کہ ان لوگوں کے پاس نہ علم تھا اور نہ ہی علم کا شائبہ' صرف وہ اپنے باپ دادوں کی پیروی کرتے تھے اور وہ بھی تمام شیطانی کاموں میں۔

اور یوں ان کی زبان سے یہ قول مناسبت رکھتا ہے:

﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا﴾

کیونکہ انہوں نے اپنے آباء واجداد کو جس چیز پر پایا تھا اس سے علم کا کوئی تعلق نہ تھا' نہ ہی علم کا اور نہ ہی شائبہ علم کا۔

ان کا یہ جواب ان کے حال کی عکاسی کرتا ہے۔

اور جہاں تک سورۃ لقمان کا تعلق ہے تو وہاں ان کے اس قول سے پہلے یہ کہا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ﴿۲۰﴾﴾

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم' ہدایت یا روشن کتاب کے بحث کرتے ہیں۔''

یہاں علم کا ذکر ہے چاہے منفی نوعیت کے انداز میں۔ وہ لوگ اس گمان کی بنا پر بحث ومجادلہ کر رہے تھے کہ

ان کے پاس اس بارے میں علم پایا جاتا ہے' جیسا کہ سورۃ المجادلہ کی آیت میں ایسے لوگوں کے بارے میں کہا گیا:

﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ﴾ (آیت ۱۸)

''اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ کسی چیز پر (کھڑے) ہیں۔''

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بحث وجدال کرنے والا ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ علم کی بنا پر بات کر رہا ہے اور اس لحاظ سے ایسے لوگوں کے منہ سے یہ کہنا مناسب لگتا ہے:

﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا﴾

اور وہ اس لیے کہ لفظ ''وَجَدَ'' بمعنی علم بھی آتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ لفظ ''اَلْفٰی'' میں بنسبت ''وَجَدَ'' کے زیادہ حروف ہیں' اور سورۃ البقرۃ کی طوالت کو دیکھتے ہوئے وہاں ''اَلْفٰی'' زیادہ مناسب تھا اور سورۃ لقمان کے اختصار کو دیکھتے ہوئے اس سورت میں ''وَجَدَ'' مناسبت رکھتا تھا اور اس بات کا تعلق بلاغت سے ہے جہاں الفاظ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

اور یوں لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے مناسبت واضح ہوگئی۔

اضافہ از مترجم: مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں ''وَجَدَ'' اور ''اَلْفٰی'' کے مابین فرق کے ضمن میں لکھا ہے کہ وَجَدَ کسی چیز کو موجود دیکھنے کے لیے عام ہے اور ہر جگہ استعمال ہوسکتا ہے' جیسے' فرمایا:

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ﴾ (آل عمران:۳۷)

''زکریاؑ جب کبھی مریم کے پاس آتے ان کی عبادت گاہ میں تو ان کے پاس رزق پاتے۔''

اور اَلْفٰی بمعنی کسی چیز کے آگے سے حجاب دور ہونا اور اس کا ظاہر ہوجانا' یا کسی چیز کا از خود علم میں آجانا۔ فرمایا:

﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ﴾ (یوسف: ۲۵)

''اور وہ دونوں دروازے کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پکڑ کر کھینچا اور اسے پھاڑ ڈالا اور دونوں کو دروازے کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا﴾

اس آیت میں اَلْفٰی کا استعمال اس لحاظ سے ہوا ہے کہ یہ چیز انہیں نسلاً بعد نسل ورثہ میں ملی تھی۔ دوسرے مقام پر ''اَلْفٰی'' کی جگہ ''وَجَدَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''وَجَدَ'' کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ فرمایا: ﴿قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا ؕ﴾ (المائدۃ:۱۰۴) ''کہتے ہیں جس طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا وہی ہمیں کافی ہے۔''

(۳۲) آیت ۱۷۲۔۱۷۳ :

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو۔ بے شک اُس نے تمہارے اوپر مردہ گوشت' (بہتا ہوا) خون' سور کا گوشت اور وہ (حیوانات) جن پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو' حرام قرار دیا ہے۔ اور جو شخص مجبور ہو جائے تو اسے (ان کے کھانے) پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ (کھانے کی) خواہش نہ رکھتا ہو اور نہ ہی (کھانے میں) زیادتی کرنے والا ہو۔''

اس آیت سے ملتی جلتی تین اور آیتیں ہیں جن میں ''وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' وارد ہوا ہے۔ پہلی سورۃ المائدۃ کی:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ..... ﴾ (آیت ۳)

''حرام کیا گیا ہے تم پر مردار' (بہتا ہوا) خون' سور کا گوشت اور (وہ جانور) جس پر پکارا گیا ہو اللہ کے سوا کسی اور کا نام.....''

دوسری سورۃ الانعام کی:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ ﴾ (آیت ۱۴۵)

''آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لیے جو اس کو کھائے' مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا کہ بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو' کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نام پر مخصوص کیا گیا ہو۔''

اور تیسری آیت سورۃ النحل کی:

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ ﴾ (آیت ۱۱۴)

''پس جو کچھ حلال اور پاکیزہ روزی اللہ نے تمہیں دے رکھی ہے اسے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو۔ بے شک اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا جائے حرام قرار دیا ہے۔''

ان آیات میں پانچ سوالات اُبھرتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ کی آیت میں ضمیر ''بِهٖ'' کی تقدیم ہے جبکہ باقی تین آیات میں تاخیر ہے۔

(۲) البقرۃ کی آیت میں خاص طور پر ''فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ'' کا ذکر ہے۔

(۳) الانعام کی آیت میں خاص طور پر ''فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' آیا ہے۔

(۴) سورۃ المائدۃ میں ان چار حرام چیزوں کے بعد مزید محرمات کا ذکر ہے۔

(۵) سورۃ المائدہ میں ان محرمات کے بعد یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ

لِّاِثۡمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳﴾ جن کا مطلب ہے ''پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بہت بڑا مہربان ہے۔''

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عربوں کا قاعدہ تھا کہ اگر کسی چیز کا خاص خیال ہوتا یا اس کی زیادہ اہمیت ہوتی یا اس کے لیے تکریم پائی جاتی تو اس چیز کو یا اس کی ضمیر کو پہلے ذکر کیا جاتا' تاکہ اس کی اہمیت کو واضح کیا جا سکے۔

دیکھئے کہ ایک کہنے والا کہتا ہے: اِيَّاكَ أَعْنِيْ (تجھ ہی کو میں اشارہ کر رہا ہوں)

اور جواباً دوسرا کہتا ہے: وَعَنْكَ اُعْرِضُ (اور تجھ ہی سے میں منہ پھیرتا ہوں)

سیبویہ نے یہ رجزیہ کلام بطور دلیل لکھا ہے:

لَتَقْرَبَنَّ قَرَبًا جلذيًّا ما دَامَ فيهِنَّ فَصِيْلٌ حَيًّا

فَقَدْ دَجَا اللَّيْلُ فَهَيًّا هَيًّا

''تمہیں (پانی کی تلاش میں) میں جلد جلد بھاگنا ہوگا جب تک کہ ریوڑ میں ایک بھی اونٹ کا بچہ باقی ہے۔ پس رات قریب آ چکی ہے تو پھر آؤ بھاگیں!''

یہاں ''فِيْهِنَّ'' ضمیر کی تقدیم سے وہ زور پیدا ہوا ہے جو اس کی تأخیر سے پیدا نہ ہوتا۔

اور فرمایا:

☆ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾﴾ (الاخلاص) : ''اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے''

☆ ﴿فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ﴾ (یونس:۵۸) : ''اور پھر اس پر انہیں خوش ہونا چاہیے۔''

☆ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحة): ''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

اور ضمائر' ظروف زمان اور مجرورات میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔ فرمایا:

☆ ﴿وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾ (یوسف) : ''اور وہ تو اس کے بارے میں بہت بے رغبت تھے۔''

☆ ﴿اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾﴾ (الشعراء) : ''میں تمہارے اس کام سے سخت ناخوش ہوں۔''

سیبویہ کہتا ہے کہ عرب اُس چیز کو جسے اہم سمجھتے تھے اور جس کا بیان کرنا زیادہ ضروری سمجھتے تھے' پہلے بیان کرتے تھے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ آیت سورۃ البقرۃ سے پہلے دو نعمتوں کا بیان ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ﴾ (آیت ۱۶۸)

''اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور طیب ہے اس میں سے کھاؤ۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾﴾

''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

یہاں پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان ہوا ہے' وہ نعمتیں جو مباح کے درجے میں ہیں اور پھر ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور پھر ''اِنَّمَا'' کے صیغے کے ساتھ چار حرام چیزوں کا بیان کیا گیا ہے۔ ''اِنَّمَا'' کے

صیغے سے دو باتوں کا احاطہ ہو گیا۔ ایک تو حصر کا‘ یعنی یہی چار چیزیں حرام ہیں جبکہ مباح چیزیں بے شمار ہیں جن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور پھر مفہومِ مخالف یا دلیل خطاب کے ذریعے یہ بات اور زیادہ مؤکد ہوتی چلی گئی ہے۔

(مفہوم مخالف کا مطلب یہ ہے کہ جیسے استاد طلبہ کو مخاطب کر کے کہے کہ انعام محنتی طلبہ کو ملے گا‘ تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ غیر محنتی طلبہ کے لیے انعام نہیں ہوگا۔)

اب ملاحظہ ہو کہ مفہوم کا اعتبار کہاں شدت سے ہوتا ہے اور کہاں نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک حدیث میں کہا گیا: ((اِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ)) ’’حق ولاء (وراثت) صرف اُس کے لیے ہے جس نے غلام کو آزاد کیا ہو‘‘۔ اب اس کلام کا مفہوم ان دو احادیث سے زیادہ قوی ہے جو ’’اِنَّمَا‘‘ کے بغیر بیان ہوئی ہیں‘ جیسے: ((فِیْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ)) ’’ہر وہ فصل جو بارش سے پروان چڑھے‘ اس میں عشر واجب ہے‘‘ یا ((فِیْ سَائِمَةِ الْغَنَمِ الزَّکَاۃ)) ’’چرنے والی بکریوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔‘‘

اور چونکہ اس آیت میں محرمات کے بیان میں وہ تاکید پائی گئی جو دوسری آیات میں نہیں ہے اس لیے ’’بِہٖ‘‘ کی ضمیر کو پہلے لایا گیا (وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ)۔ گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ اللہ نے تم پر مردار‘ خون‘ سور کا گوشت اور وہ سب حرام قرار دیا ہے جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ ’’مَآ اُهِلَّ بِهٖ‘‘ کہہ کر بقیہ تین چیزوں کے ساتھ چوتھی چیز (یعنی جس پر نام لیا گیا ہے) کا ذکر مربوط کر دیا گیا ہے اور آخر میں ’’لِغَيْرِ اللّٰهِ‘‘ کہہ کر بتا دیا گیا کہ اس نام سے مراد اللہ کے سوا کسی اور چیز کا نام ہے۔

مزید وضاحت کے لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ’’وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ‘‘ تک زور اس بات پر ہے کہ اس چیز پر نام لیا گیا ہے‘ اور پھر قاری کے ذہن میں جستجو ہوگی کہ کس کا نام لیا گیا ہے کہ یہ چیز حرام اشیاء کے ضمن میں بیان ہو رہی ہے؟ تو فوراً کہہ دیا گیا: لِغَيْرِ اللّٰهِ ’’اللہ کے سوا کسی اور چیز کا۔‘‘

باقی تینوں آیات میں چونکہ یہ تفصیل نہ تھی اس لیے ضمیر کو پہلے نہیں لایا گیا‘ بلکہ ضمیر جہاں آنی چاہئے یعنی آخر کلام میں وہیں لائی گئی۔ اور چونکہ اس آیت میں وہ کچھ تفصیل ہے جو دوسری آیات میں نہیں اس لیے اس کے آخر میں ’’فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ‘‘ کا اضافہ کر دیا گیا۔ یعنی جہاں کلام میں پہلے ہی تفصیل ہو تو وہاں مزید تفصیل میں کوئی حرج نہیں اور جہاں کلام مختصر ہو تو وہاں سارے کلام میں اختصار ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے اور اس طرح دوسرے سوال کا جواب بھی آ گیا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت (جس میں چاروں حرام چیزوں کا ذکر ہے) سے پہلے مشرکین کو ان کے شرک پر ڈانٹ پلائی گئی ہے‘ خاص طور پر ان جانوروں کے بارے میں جنہیں وہ اپنے اوپر حرام قرار دیتے تھے اور پھر یہ فرمایا:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ (الانعام)

’’کیا تم حاضر تھے جس وقت اللہ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا تھا؟ تو اس سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے تاکہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔‘‘

پھر اس کے بعد آیت ۱۴۵ ہے جس میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ﴾

اور آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾﴾ (الانعام)

(آیت کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے)

سوال یہ تھا کہ اس آیت کے آخر میں خاص طور پر کہا گیا: ﴿فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾﴾

عربی میں اس اسلوب بیان کو التفات کہا جاتا ہے۔

یعنی ''فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ'' (جو مجھ پر وحی کی گئی) کی مناسبت سے یہاں ''فَاِنَّ رَبِّیْ'' یا ''فَاِنَّ اللّٰهَ'' ہونا چاہیے تھا' لیکن اس کے بجائے خطاب کا صیغہ لایا گیا اور کہا گیا: ''فَاِنَّ رَبَّكَ''۔ اسے ''التفات'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یکدم خطاب کو ایک صیغے سے دوسرے صیغے کی طرف موڑ دیا گیا ہے' اور اس طرح کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے اور اسے سمجھنے میں زیادہ شوق پیدا ہوتا ہے' اور یہاں یہ بھی ملاحظہ ہو کہ بجائے ''اللّٰہ'' کے ''ربّ'' لایا گیا تاکہ مشرکین کے شرک کے مقابلے میں اللہ کی ربوبیت کی طرف اشارہ ہو جائے' اور پھر ''رَبَّكَ'' (تیرا ربّ) کہہ کر نبی ﷺ کی عظمت کو ابھارا گیا۔

یہاں اگر ربوبیت کا اظہار زیادہ مناسب تھا تو ایک دوسری جگہ کفار کے تکبر اور رعونت کے مقابلے میں لفظ ''اللّٰہ'' کو لانا مناسب سمجھا گیا' جیسے سورۂ محمد میں کفار کو تباہ و برباد کرنے کے تذکرے کے بعد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَهُمْ ﴿۱۱﴾﴾

''اور وہ اس لیے کہ اللہ ایمان والوں کا دوست ہے اور کفار کا کوئی دوست نہیں۔''

اور اس طرح سورۃ الانعام کی آیت کے آغاز اور اختتام میں مناسبت واضح ہو گئی۔

چوتھا اور پانچواں سوال سورۃ المائدۃ کے بارے میں ہے کہ اس میں صرف چار حرام چیزوں کا ذکر نہیں بلکہ مزید حرام چیزوں کا بھی ذکر ہے اور آخر میں صرف اضطرار کا ذکر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ﴿فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ﴾ کا اضافہ بھی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ کی یہ آیات اُن آیات میں سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخر میں نازل ہوئیں اور اس لیے ان چار چیزوں کے ساتھ باقی حرام چیزوں کا بھی ذکر کر دیا گیا تاکہ کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے' اور جس طرح یہاں باقی دوسری آیات کے مقابلے میں محرمات کی تفصیل ذرا زیادہ ہے' اسی طرح یہاں اضطرار کی بھی تفصیلی شکل پیش کر دی گئی' یعنی یہ اضطرار بھوک کی بنا پر ہے اور حرام کھانے والے میں گناہ کی طرف میلان نہیں ہے۔

چونکہ اس آیت سے قبل ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ﴾ کی نوید بھی سنائی گئی تھی اس لیے مناسب تھا کہ محرمات اور اضطرار کی شکل' دونوں کی تفصیل بیان کی جاتی تاکہ کوئی اشکال باقی نہ رہ جائے۔

(۳۳) آیت ۱۵۹:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ م بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ لا اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾﴾

''بے شک جولوگ چھپاتے ہیں ان دلائل اور (براہین) ہدایت کوجنہیں ہم نے اتارا ہے' باوجود یکہ ہم نے انہیں (اپنی) کتاب میں لوگوں کے لیے بیان کر دیا ہے' ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔''

اور پھر پندرہ آیات کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا لا اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ ج وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۴﴾﴾

''بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں وہ چیز جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کی ہے اور اس کے بدلے معمولی قیمت سے اسے بیچ دیتے ہیں' ایسے لوگ اپنے پیٹوں میں صرف آگ کھا رہے ہیں' اللہ قیامت کے دن ان سے نہ بات کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

پھر سورۂ آل عمران کی آیت ۷۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ ص وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۷﴾﴾

''بے شک جولوگ اللہ سے کیے گئے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اللہ تعالیٰ نہ تو ان سے بات چیت کرے گا' نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا' نہ انہیں پاک کرے گا' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کرسکتا ہے کہ سورۃ البقرۃ کی دونوں آیات میں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ﴾ کہہ کر ان کے وحی الٰہی کو چھپانے کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے' جبکہ بظاہر سورۂ آل عمران کی آیت میں بھی انہی لوگوں کا ذکر ہے لیکن وہاں چھپانے کا ذکر نہیں ہے' اور دوسری بات یہ ہے کہ باوجود یکہ ان کے جرم کی نوعیت ایک جیسی ہے لیکن انہیں دی جانے والی سزا میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے' اور تیسری بات یہ ہے کہ جرم اور سزا کے اعتبار سے ہر آیت کا کیا خاص مقام ہے؟

پہلی دو آیات کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ ان آیات سے قبل اسی سورت میں یہ حکم گزر چکا ہے:

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ (البقرۃ)

''اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں حق کو چھپانے سے منع کیا ہے لیکن اس کے بعد کسی سزا کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ چیزیں بتائی گئی ہیں کہ جن سے انہیں نجات حاصل ہوسکتی ہے' پھر بڑی نرمی سے انہیں اہل تقویٰ کا راستہ اپنانے کی ہدایت کی جارہی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (البقرۃ)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

ملاحظہ ہو کہ یہاں اُن کے جرم کتمان اور دوسرے جرائم کا ذکر موجود ہے' لیکن انہیں نیکی کی دعوت دی جارہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے حلم اور بردباری کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر جب ان لوگوں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا' بلکہ تنبیہ آ جانے کے باوجود انہوں نے حق کو چھپانے کے جرم کا ارتکاب کیا تو پھر سورۃ البقرۃ ہی میں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى﴾ کہہ کر ان کی سزا کا ذکر کیا گیا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور بندوں کی طرف سے لعنت شامل ہے' اور لعنت کا مطلب ہی ہے اللہ کی رحمت سے دوری اور دھتکارا جانا۔ البتہ یہاں ان لوگوں کے لیے رحمت کی نوید بھی سنائی گئی جو توبہ کر لیتے ہیں اور پھر اپنی اصلاح بھی کر لیتے ہیں' اور کتمانِ حق کے جرم کے بعد بیانِ حق کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

پھر اس کے بعد سورۃ البقرۃ کی اگلی آیت میں انہی لوگوں کا تذکرہ ہے جو کتمانِ حق کے جرم کے علاوہ ایک دوسرے جرم کا بھی ارتکاب کرتے ہیں اور وہ ہے قرآن کی آیات کو دنیا کی متاعِ حقیر کے عوض بیچ ڈالنا' اور چونکہ یہاں ایک مزید جرم کا تذکرہ تھا اس لیے سزا میں بھی ایک اور چیز کا اضافہ کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾﴾

یہاں چار سزاؤں کا ذکر ہے:

(۱) اپنے پیٹوں کو آگ سے بھریں گے'

(۲) قیامت کے دن اللہ ان سے بات نہ کریں گے'

(۳) ان کی تطہیر نہ کریں گے'

(۴) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اور پھر اس آیت میں توبہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے توبہ کا دروازہ نہیں کھلا ہے' بلکہ توبہ کا ذکر نہ کر کے ان کے جرائم کی سنگینی دکھلانا مقصود ہے۔ دیکھئے! یہاں ان کی **تطہیر** (تزکیہ) کے نہ کرنے کا ذکر ہے' کیونکہ تزکیہ کا مطلب ہے کسی کو گناہوں سے پاک کرنا جو کہ توبہ نصوح کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ یہاں توبہ کا ذکر اس لیے بھی مناسب نہ تھا کہ اگلی آیت میں ان کی اُخروی حالت کا بھی یوں بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خرید ڈالا' تو اب یہ لوگ آگ کا عذاب کیسے برداشت کیے ہوئے ہیں!''

چونکہ بالآخر ان کی یہ حالت ہونے والی تھی اس لیے یہاں توبہ کا ذکر مناسب نہ تھا۔ اب آیئے اس بات کی طرف کہ یہاں خاص طور پر اپنے پیٹوں میں آگ کھانے کا ذکر کیوں ہے؟ اور وہ اس لیے کہ اس آیت سے قبل

دو دفعہ اکل حلال کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ﴾(آیت ۱۶۸)

''اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ۔''

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۷۲)

''اے ایمان والو! ہم نے جو پاکیزہ چیزیں تمہیں عطا کی ہیں' ان میں سے کھاؤ۔''

بتا دیا گیا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟

اور چونکہ یہاں کھانے کا ذکر تھا تو پھر ان کھانے والوں کا بھی تذکرہ کر دیا جو اللہ کی آیات میں تحریف اور تغییر کر کے اپنی کمائی کو برباد کرتے ہیں اور پھر ان کا کھانا پینا بھی خباثت کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔ گویا اگر ان کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے تو وہ دیکھ سکیں گے کہ وہ تو آگ کو کھا رہے ہیں۔ اور یہاں بُطون (پیٹ) کا ذکر کیا تو یہاں ''اَکَلَ'' بمعنی ''جَعَلَ'' ہوگا' کیونکہ عموماً آگ کو کھایا نہیں جاتا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے پیٹوں میں اپنی گندی تجارت کی بنا پر آگ کو جگہ دے رہے ہیں۔ اسی طرح کی بات ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمائی:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ﴾ (النساء)

''بے شک جو لوگ یتیموں کے مال کو بربنائے ظلم کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کو کھا رہے ہیں۔''

یہاں بھی بظاہر لفظ ''اَکَلَ'' لایا گیا ہے لیکن ''جَعَلَ'' کے معنی میں ہے' اور سیاق وسباق سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہمارے کہنے کا طلب یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک لفظ لایا جاتا ہے جس کا اپنا ایک معنی ہوتا ہے' لیکن وہ لفظ اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے ایک دوسرے معنی کو لازم ہوتا ہے کہ جس سے اصل مقصود ظاہر ہو جاتا ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت میں جن لوگوں کی جزا کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بظاہر کتمانِ حق کا وصف بیان نہیں ہوا ہے' لیکن اگلی آیت میں ایک ایسا وصف بتایا گیا ہے جو کتمانِ حق کو لازم ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾

''یقیناً ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبان مروڑتا ہے تاکہ تم اسے کتاب ہی کی عبارت خیال کرو حالانکہ وہ دراصل کتاب میں سے نہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے' اور وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔''

اور ایک آیت قبل ان کے ایک اور قبیح وصف کا بیان ہوا۔ فرمایا:

﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآىِٕمًا ؕ﴾ (آیت ۷۵)

''بعض اہلِ کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں تو ڈھیر سارے مال کا امین بنا دے تو بھی وہ تجھے واپس کر دیں گے' اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تو انہیں ایک دینار بھی بطور امانت دے تو تجھے ادا نہ کریں گے اِلا یہ کہ تو ان کے سر پر کھڑا رہے۔''

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ سورۂ آل عمران کی آیات میں وہی سزائیں بیان ہوئی ہیں جو سورۃ البقرۃ کی آیات میں بیان ہوئیں' اور دونوں جگہ گو الگ الگ لوگ مراد ہیں لیکن دونوں طرح کے لوگوں میں ایک وصف مشترک ہے اور وہ ہے کتمانِ حق۔

(۳۴) آیت ۱۸۷ :

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ﴾

''اور ان سے مباشرت نہ کرو جبکہ تم مسجدوں میں حالت اعتکاف میں ہو' یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔''

پھر اسی سورت کی آیت ۲۲۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ﴾ ''یہ اللہ کی حدیں ہیں' انہیں تجاوز نہ کرو۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں ''فَلَا تَقْرَبُوْهَا'' کہا گیا اور دوسری جگہ ''فَلَا تَعْتَدُوْهَا'' کہا گیا تو اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے (واللہ اعلم) کہ اگر کسی چیز کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا گیا ہو تو اس چیز کے شدت سے حرام ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر عورتوں کی قربت حاصل ہو گی تو پھر ان سے تعلق قائم کرنے کی تحریک بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اور اکثر لوگ اپنی خواہش پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں میرا بوسہ لیا کرتے تھے' وہ اس لیے کہ وہ اپنی خواہش پر پوری طرح قابو رکھتے تھے' لیکن تم میں سے کون ہے جو اپنی خواہش پر اتنا قابو رکھتا ہو؟'' (بخاری' ترمذی' دارمی)

اب چونکہ جس حرام چیز کی طرف یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے اور وہ ہے عورت سے جنسی تعلق قائم کرنا' تو جو چیز بھی اس کا سبب بن سکتی ہو یعنی عورت کی قربت حاصل کرنا' تو اس سے بھی منع کر دیا گیا۔ ملاحظہ کریں کہ یہی الفاظ اسی فعل کی ممانعت کے ضمن میں دوسری جگہ بھی وارد ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حائضہ عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

''اور ان کے قریب بھی نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ (الاسراء:۳۲) ''اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔''

اور یہی وجہ ہے کہ حالت احرام میں خوشبو لگانے سے منع کیا گیا' کیونکہ اس کی وجہ سے شہوت بھڑک سکتی

ہے۔ چنانچہ جہاں حرام چیز کی شدت بیان کرنا مقصود ہو‘ چاہے وہ مذکورہ قسم میں سے ہو یا مالی امور سے متعلق ہو‘ تو وہاں اس طرح کے الفاظ آتے ہیں کہ ’’اس چیز کے قریب تک نہ جاؤ‘‘۔ اس کے برخلاف جہاں صرف حلال و حرام میں فرق کرنا مقصود ہو نہ کہ حرام چیز کی شدت کو بیان کرنا تو وہاں صرف حد کو نہ پھلانگنے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

آیت ۲۲۹ (فَلَا تَعْتَدُوْهَا) سے قبل طلاق کے احکامات بیان ہو رہے تھے‘ جس کا آغاز اس آیت سے ہوا: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ ’’طلاق دو مرتبہ ہے‘‘۔ پھر خلع کا بیان ہوا۔ ارشاد فرمایا:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ﴾ (۲۲۹)

’’پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ کر سکیں گے تو پھر ان پر کوئی حرج نہیں اس (عوض) کے بارے میں جسے دے کر عورت چھٹکارا حاصل کرے۔‘‘

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ﴾ ’’یہ اللہ کی حدیں ہیں انہیں مت تجاوز کرو‘‘

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مَردوں پر عورتوں کے مال حرام ہیں‘ اِلا یہ کہ ان سے نشوز اور نافرمانی واقع ہوئی ہو‘ اور پھر اگر مرد اور عورت میں حقوق کا احترام نہ کیا جا رہا ہو‘ اور ان میں سے ایک کو یا دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی وضع کردہ حدود کی پابندی نہ کر سکیں گے‘ اور پھر مرد کی طرف سے عورت کو ضرر پہنچانے کا قصد بھی نہ ہو‘ تو ایسی صورت میں مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ عورت سے کچھ مال لے کر اسے شادی کے بندھن سے آزاد کر دے‘ یعنی:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ﴾

’’تو پھر ان دونوں پر کوئی حرج نہیں اس (مال) کے بارے میں جسے دے کر عورت چھٹکارا حاصل کر سکے۔‘‘

یہاں صرف حلال اور حرام کا معاملہ ہے‘ بیچ میں کوئی واسطہ نہیں ہے‘ نہ ہی یہاں کوئی ایسی چیز ہے جو حرام کا سبب بنتی ہو کہ اس کی حرمت کی شدت کی طرف اشارہ کیا جائے‘ اور اس لیے یہاں صرف حد کو نہ پھلانگنے کا ذکر کافی ہے‘ یعنی حلال کی حد میں رہو‘ حرام تک تجاوز نہ کرو۔ اور اس وضاحت کے بعد عیاں ہو گیا کہ یہ دونوں الفاظ موقع اور محل کے اعتبار سے پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں۔

(۳۵) آیت ۱۹۳ :

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾﴾

’’اور ان سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے (غالب) ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو پھر زیادتی صرف ظالموں پر ہی کی جا سکتی ہے۔‘‘

اور پھر سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾﴾

''اوران سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارا کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے ان سب اعمال کو جو وہ کر رہے ہیں۔''

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

سورۃ الانفال میں ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ کہہ کر مزید خصوصیت کا اظہار کیا گیا جو کہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ کہ دونوں آیات کا آخری حصہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

سورۃ البقرۃ کے آخر میں فرمایا:

﴿فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹۳﴾

اور سورۃ الانفال کے آخر میں فرمایا:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳۹﴾

تو اس کی کیا وجہ ہے؟

دونوں سوالات کا جواب یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں خاص طور پر اہل مکہ کا ذکر ہے جو نبی ﷺ سے دشمنی کا اظہار کر رہے تھے اور ان تمام لوگوں کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا رہے تھے جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے' انہیں گھروں سے دھتکار رہے تھے۔ اس لیے اس ظلم کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان سے قتال کرنے کو جائز ٹھہرایا۔ سورۃ الحج میں وہ پہلی آیت اتری جس میں قتال کی اجازت دی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ﴾ (آیت ۳۹)

''جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انہیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔''

اور سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت سے پہلے ارشاد فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (آیت ۱۹۰)

''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑائی کرو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں۔''

اور پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ﴾ ''اور زیادتی نہ کرو''

یعنی واضح کر دیا کہ صرف انہی لوگوں سے لڑائی تک محدود رہو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور انہیں جہاں کہیں بھی پاؤ' قتل کر ڈالو۔''

یہاں بھی وہی خاص لوگ مراد ہیں جن سے کلام کا آغاز ہوا ہے۔ اور یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا:

﴿وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱)

اور پھر اس بات کو ملاحظہ کریں کہ یہ قتال کس لیے تھا؟ اسی لیے نا کہ وہ اسلام کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دیں اور دین میں داخل ہو جائیں' اس لیے اگر وہ بظاہر کلمۂ شہادت پڑھ لیں اور اسلام کا اظہار کرنا شروع کر دیں تو ایسی صورت

میں ان سے قتال کرنا جائز نہیں رہا بلکہ ان کے باطن کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے' اور اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳۹﴾ (الانفال)

''پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔''

یعنی اللہ ان کے اعمال کو بخوبی دیکھتا ہے' تمہیں ان کے دلوں کو ٹٹولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر یہ حدیث بھی اس آیت کے مفہوم کو واضح کرتی ہے:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَاِنْ قَالُوْا عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ)) (بخاری' مسلم بروایت ابوہریرۃ' ابن عمر اور جابر)

''مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑائی کروں جب تک کہ وہ لا الٰہ اِلا اللہ نہ کہیں۔ اگر وہ اسے کہہ دیں تو پھر وہ میرے ہاتھوں سے اپنے خون اور اپنے مال کو محفوظ پائیں گے' اِلا یہ کہ ان سے کوئی حق متعلق ہو' اور پھر اللہ ان کا حساب کرے گا۔''

چونکہ دونوں آیات کا مقصود الگ الگ تھا اس لیے ہر آیت کے آخر میں وہ چیز بیان ہوئی جو اس کے مضمون سے مناسبت رکھتی تھی۔ واللہ اعلم!

❁❁❁

تصحیح : گزشتہ شمارے میں ''ملاك التاويل'' کی قسط کے آخر میں غلطی سے چند سطریں اضافی طور پر شائع ہوگئی تھیں' جن کا ربط سابقہ عبارت سے نہیں بنتا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ازراہِ کرم ''اور سورۂ قٓ کی آیات (۹ تا ۱۱) میں ارشاد فرمایا'' سے آخر تک کی عبارت حذف کر دی جائے۔ یہ عبارت موجودہ قسط میں مربوط طور پر شامل ہے۔ (ادارہ)

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الانعام

آیات ۱۳۶ تا ۱۴۰

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا
لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ
لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا
هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا
وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا مَا
فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ
شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا
بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ع

ذرء

ذَرَأَ يَذْرَأُ (ف) ذَرْأً: اللہ تعالیٰ کا اپنے ارادے کو ظاہر کرنا۔ (۱) پیدا کرنا۔ (آیت زیر مطالعہ ۱۳۶) (۲) بکھیرنا' پھیلانا۔ ﴿وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ﴾ (النحل:۱۳) ''اور وہ جو اُس نے بکھیرا تمہارے لیے زمین میں مختلف ہوتے ہوئے ان کے رنگ۔''

ترکیب

(آیت ۱۳۶) ''جَعَلُوْا'' کا مفعول ''نَصِيْبًا'' ہے۔ (آیت ۱۳۷) ''زُيِّنَ'' کا مفعول ''قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ''

ہے اور اس کا فاعل ''شُرَکَاءُ ھُمْ'' ہے۔ (آیت ۱۳۸) ''ھٰذِہٖ'' مبتدأ ہے۔ ''اَنْعَامٌ'' اور ''حَرْثٌ'' اس کی خبریں ہیں' جبکہ ''حِجْرٌ'' ان دونوں کی صفت ہے۔ اس کے آگے ''اَنْعَامٌ'' دو مرتبہ آیا ہے اور دونوں جگہ یہ نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''اِفْتِرَاءً'' حال ہے اور ''عَلَیْہِ'' کی ضمیر اللہ کے لیے ہے۔ (آیت ۱۳۹) ''مَا'' موصولہ مبتدأ ہے۔ ''فِیْ بُطُوْنِ ھٰذِہِ الْاَنْعَامِ'' قائم مقام خبر ہے۔ اس کی خبر ''مَوْجُوْدٌ'' محذوف ہے' جبکہ ''خَالِصَۃٌ'' اور ''مُحَرَّمٌ'' صفت ہیں۔ ان آیات میں مشرکین کی مستقل عادت کا بیان ہے' اس لیے اردو محاورہ کی ضرورت کے تحت افعالِ ماضی کا ترجمہ حال میں ہوگا۔

ترجمہ:

وَجَعَلُوْا : اور وہ لوگ بناتے ہیں
مِمَّا : اس میں سے جو
مِنَ الْحَرْثِ : کھیتی میں سے
نَصِیْبًا : ایک حصہ
ھٰذَا : یہ
بِزَعْمِھِمْ : ان کے گمان میں
لِشُرَکَآئِنَا : ہمارے شریکوں کے لیے ہے
کَانَ : ہوتا ہے
فَلَا یَصِلُ : تو وہ نہیں پہنچتا
وَمَا : اور جو
لِلّٰہِ : اللہ کے لیے
اِلٰی شُرَکَآئِھِمْ : ان کے شریکوں تک
مَا : وہ جو
وَکَذٰلِکَ : اور اس طرح
لِکَثِیْرٍ : بہتوں کے لیے
قَتْلَ اَوْلَادِھِمْ : اپنی اولاد کے قتل کرنے کو
لِیُرْدُوْھُمْ : تاکہ وہ تباہ و برباد کریں ان کو
عَلَیْھِمْ : ان پر
وَلَوْ : اور اگر
اللّٰہُ : اللہ
فَذَرْھُمْ : پس آپؐ چھوڑ دیں ان کو

لِلّٰہِ : اللہ کے لیے
ذَرَاَ : اُس نے پیدا کیا
وَالْاَنْعَامِ : اور مویشیوں میں سے
فَقَالُوْا : پھر کہتے ہیں
لِلّٰہِ : اللہ کے لیے ہے
وَھٰذَا : اور یہ
فَمَا : پس جو
لِشُرَکَآئِھِمْ : ان کے شریکوں کے لیے
اِلَی اللّٰہِ : اللہ تک
کَانَ : ہوتا ہے
فَھُوَ یَصِلُ : تو وہ پہنچتا ہے
سَآءَ : کتنا برا ہے
یَحْکُمُوْنَ : یہ لوگ فیصلہ کرتے ہیں
زَیَّنَ : سجایا
مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ : شرک کرنے والوں میں سے
شُرَکَآؤُھُمْ : ان کے شریکوں نے
وَلِیَلْبِسُوْا : اور تاکہ وہ گڈمڈ کریں
دِیْنَھُمْ : ان کے دین کو
شَآءَ : چاہتا
مَا فَعَلُوْہُ : تو وہ نہ کرتے اس کو
وَمَا : اور اس کو جو

يَفْتَرُوْنَ: وہ گھڑتے ہیں

هٰذِهٖٓ: یہ

لَّا يَطْعَمُهَآ: نہیں کھاتا اس کو

مَنْ: وہ جسے

بِزَعْمِهِمْ: ان کے گمان میں

حُرِّمَتْ: حرام کیا گیا

وَاَنْعَامٌ: اور مویشی

اسْمَ اللّٰهِ: اللہ کا نام

افْتِرَآءً: گھڑتے ہوئے

سَيَجْزِيْهِمْ: وہ بدلہ دے گا ان کو

كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: وہ لوگ گھڑتے ہیں

مَا: وہ جو

خَالِصَةٌ: خاص ہے

وَمُحَرَّمٌ: اور حرام کیا ہوا ہے

وَاِنْ: اور اگر

مَّيْتَةً: مردہ

فِيْهِ: اس میں

سَيَجْزِيْهِمْ: وہ بدلہ دے گا ان کو

اِنَّهٗ: یقیناً وہ

عَلِيْمٌ: جاننے والا ہے

اَلَّذِيْنَ: وہ لوگ جنہوں نے

اَوْلَادَهُمْ: اپنی اولاد کو

بِغَيْرِ عِلْمٍ: کسی علم کے بغیر

مَا: اُس کو جو

اللّٰهُ: اللہ نے

عَلَى اللّٰهِ: اللہ پر

وَمَا كَانُوْا: اور وہ نہیں ہیں

وَقَالُوْا: اور وہ کہتے ہیں

اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ: ممنوع مویشی اور کھیتی ہیں

اِلَّا: مگر

نَّشَآءُ: ہم چاہیں

وَاَنْعَامٌ: اور مویشی

ظُهُوْرُهَا: جن پر سوار ہونا

لَّا يَذْكُرُوْنَ: وہ لوگ یاد نہیں کرتے

عَلَيْهَا: جن پر

عَلَيْهِ: اس پر (یعنی اللہ پر)

بِمَا: بسبب اس کے جو

وَقَالُوْا: اور وہ کہتے ہیں

فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ: ان مویشیوں کے پیٹوں میں ہے

لِّذُكُوْرِنَا: ہمارے مَردوں کے لیے

عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا: ہماری بیویوں پر

يَّكُنْ: وہ ہو

فَهُمْ: تو وہ (سب)

شُرَكَآءُ: شریک ہیں

وَصْفَهُمْ: ان کی صفت بیان کرنے کا

حَكِيْمٌ: حکمت والا ہے

قَدْ خَسِرَ: خسارے میں پڑ چکے ہیں

قَتَلُوْٓا: قتل کیا

سَفَهًا: احمق ہوتے ہوئے

وَّحَرَّمُوْا: اور حرام کیا

رَزَقَهُمُ: رزق دیا ان کو

اِفْتِرَآءً: گھڑتے ہوئے

قَدْ ضَلُّوْا: وہ بھٹک چکے ہیں

مُهْتَدِيْنَ: ہدایت پانے والے

نوٹ: مشرکین رواج کے مطابق اللہ کے نام پر کچھ نکال تو دیتے' لیکن اگر اتفاق سے کسی بُت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہوگئی یا اس کے نام کا غلہ چوہے کھا گئے' تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جاتی اور اگر اسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصے پر آ جاتی تو یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی تلافی معبودوں کے حصے کے مال سے کرنے کی جرأت کریں۔ (تدبر قرآن)

ان توہمات کی اصل جڑ کیا ہے' اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جو حصہ خدا کے نام پر نکالا جاتا ہے وہ فقیروں' مسکینوں وغیرہ پر خرچ کیا جاتا ہے اور جو حصہ شریکوں کے لیے نکالا جاتا ہے وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا ہے یا نذر و نیاز اور چڑھاوے کی صورت میں بالواسطہ مجاوروں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے مذہبی پیشواؤں نے مسلسل تلقین سے جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ خدا کے حصے میں کمی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں' لیکن ''خدا کے پیاروں'' کے حصے میں کمی نہ ہونی چاہیے۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۴۱ تا ۱۴۴

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۡ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۱۴۱ۙ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۴۲ۙ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّـــُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۴۳ۙ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۴ۧ

زرع

زَرَعَ يَزْرَعُ (ف) زَرْعًا : کھیتی کو اُگانا۔ ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝۶۳ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝۶۴﴾ (الواقعة) ''تو کیا تم لوگوں نے غور کیا اس پر جو تم لوگ بوتے ہو۔ کیا تم لوگ اُگاتے ہو اس کو یا ہم اُگانے والے ہیں؟''

زَارِعٌ (فاعل کے وزن پر اسم الفاعل) : اُگانے والا۔

زَرَّاعٌ ج زُرَّاعٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ) : بار بار اُگانے والا یعنی کسان۔ ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ (الفتح:۲۹) ''بھلی لگتی ہے کسانوں کو۔''

زَرْعٌ ج زُرُوْعٌ (اسم ذات) : اصلاً اُگی ہوئی چیز کو کہتے ہیں' پھر عرفِ عام میں کھیتی کہہ دیتے ہیں۔ ﴿وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝۱۴۸﴾ (الشعراء) ''اور کھیتیوں میں اور کھجوروں میں جن کی کونپل ملائم ہے۔''

ح ص د

حَصَدَ یَحْصُدُ (ن) وَیَحْصِدُ (ض) حَصَادًا : (۱) کھیتی کاٹنا۔ (۲) کسی چیز کو تہس نہس کرنا۔ ﴿فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖ﴾ (یوسف:۴۷) ''پھر جو تم لوگ کاٹو تو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں۔''

حَصِیْدٌ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت' اسم المفعول کے معنی میں) : (۱) کاٹا ہوا (۲) تہس نہس کیا ہوا۔ ﴿فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ ۙ﴾ (قٓ) ''پھر ہم نے اُگائے اس سے باغات اور کاٹا جانے والا اناج۔'' ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِیْدٌ ؕ﴾ (ھود) ''یہ بستیوں کی خبروں میں سے ہے' ہم بیان کرتے ہیں ان کو آپؐ پر ان میں سے کچھ قائم ہیں اور کچھ تہس نہس کی ہوئی ہیں۔''

ض ء ن

ضَأَنَ یَضْأَنُ (ف) ضَأْنًا : دنبوں کو بکریوں سے الگ کرنا۔

ضَاْنٌ (اسم جنس) : دنبہ' بھیڑ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۳۔

م ع ز

مَعَزَ یَمْعَزُ (ف) مَعْزًا : بکریوں کو بھیڑوں سے الگ کرنا۔

مَعْزٌ (اسم جنس) : بکری۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۳۔

ش م ل

شَمَلَ یَشْمُلُ (ن) شَمْلاً : بائیں جانب لینا۔

شَمِلَ یَشْمَلُ (س) شَمَلاً : کسی چیز کو کسی چیز میں لپیٹنا۔

شِمَالٌ ج شَمَائِلُ: بایاں جانب۔ ﴿وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ﴾ (الکھف:۱۸) ''اور ہم پلٹتے ہیں ان کو دائیں جانب والی (کروٹ) اور بائیں جانب والی۔'' ﴿وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷) ''اور ان کے دائیں جانب سے اور ان کے بائیں جانب سے۔''

اِشْتَمَلَ (افتعال) اِشْتِمَالاً : کسی چیز پر پورا لپٹنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۳۔

أ ب ل

أَبِلَ یَأْبَلُ (س) اَبَلًا : اونٹوں کا اچھی طرح انتظام کرنا۔

اِبِلٌ (اسم جنس): اونٹ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۴۔

اَبَابِیْلُ: اونٹوں کا قطار در قطار چلنا۔ اس کا استعمال عام ہے۔ کسی کا بھی قطار در قطار چلنا یا جھنڈ در جھنڈ اُڑنا۔ ﴿وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۙ﴾ (الفیل) ''اور اُس نے بھیجا ان پر جُھنڈ در جُھنڈ پرندوں کو۔''

ترکیب

(آیت ۱۴۱) ''اَنْشَاَ'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے ''جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ'' حالت نصب میں ہے' جبکہ ''غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ'' میں ''غیر'' کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے ''مَعْرُوْشٰتٍ'' حالت جر میں ہے اور یہ مرکب اضافی بھی ''اَنْشَاَ'' کا مفعول ہے' اس لیے ''غَیْرَ'' پر نصب آئی ہے۔ اس کے آگے ''اَلنَّخْلَ' اَلزَّرْعَ'

اَلزَّیْتُوْنَ'' اور ''اَلرُّمَّانَ'' یہ سب بھی ''اَنْشَاَ'' کے مفعول ہیں۔ ''حَقَّهٗ'' کی ضمیر ''هُوَ الَّذِیْ'' یعنی اللہ کے لیے ہے۔ (آیت۱۴۲) ''مِنَ الْاَنْعَامِ'' سے پہلے ''اَنْشَاَ'' محذوف ہے۔ (آیت۱۴۳) اسی طرح ''ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ'' میں ''ثَمٰنِیَةَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے بھی ''اَنْشَاَ'' محذوف ہے۔ ''ءٰآلذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ'' کا مفعول مقدم ہے جبکہ ''اَلْاُنْثَیَیْنِ'' اور ''اَمَّا'' (جو دراصل ''اَمْ مَا'' ہے) بھی ''حَرَّمَ'' کے مفعول ہیں۔ (آیت۱۴۲) ''كُنْتُمْ'' کا اسم اس میں شامل ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے اور ''شُهَدَاءَ'' اس کی خبر ہے۔

ترجمہ:

وَهُوَ :اور وہ	الَّذِیْٓ :وہ ہے جس نے
اَنْشَاَ :پیدا کیا	جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ :چھپر پر ڈالے ہوئے باغات کو
وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ:اور چھپر پر نہ ڈالے ہوؤں کو	وَّالنَّخْلَ :اور کھجور کو
وَالزَّرْعَ :اور کھیتی کو	مُخْتَلِفًا :مختلف ہوتے ہوئے
اُكُلُهٗ :اس کا پھل	وَالزَّیْتُوْنَ :اور زیتون کو
وَالرُّمَّانَ :اور انار کو	مُتَشَابِهًا :باہم متشابہ ہوتے ہوئے
وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ:اور باہم مشابہ نہ ہونے والے	كُلُوْا :تم لوگ کھاؤ
مِنْ ثَمَرِهٖٓ :اس کے پھل میں سے	اِذَآ اَثْمَرَ :جب بھی وہ پھل دے
وَاٰتُوْا :اور تم لوگ دو	حَقَّهٗ :اس کا حق
یَوْمَ حَصَادِهٖ :اس کی فصل کاٹنے کے دن	وَلَا تُسْرِفُوْا :اور ضرورت سے زیادہ مت خرچ کرو
اِنَّهٗ :بے شک وہ	لَا یُحِبُّ :پسند نہیں کرتا
الْمُسْرِفِیْنَ: ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے والوں کو	وَمِنَ الْاَنْعَامِ:اور (اُس نے پیدا کیے) مویشیوں میں سے
حَمُوْلَةً :کوئی بکثرت بوجھ اٹھانے والے	وَّفَرْشًا :اور کوئی بچھا ہوا
كُلُوْا :تم لوگ کھاؤ	مِمَّا :اس میں سے جو
رَزَقَكُمُ :رزق دیا تم کو	اللّٰهُ :اللہ نے
وَلَا تَتَّبِعُوْا :اور تم لوگ پیروی مت کرو	خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ:شیطان کے نقوش قدم کی
اِنَّهٗ :بے شک وہ	لَكُمْ :تمہارے لیے
عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ :ایک کھلا دشمن ہے	ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ:(اس نے پیدا کیے) آٹھ جوڑے
مِنَ الضَّاْنِ :بھیڑ میں سے	اثْنَیْنِ :دو

وَمِنَ الْمَعْزِ :اور بکری میں سے
قُلْ : آپؐ کہیے (یعنی پوچھئے)
حَرَّمَ : اُس نے حرام کیا
الْاُنْثَيَيْنِ : دو مؤنث کو
اشْتَمَلَتْ :لپٹیں
اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ : دو مؤنث کی بچہ دانیاں
بِعِلْمٍ : کسی علم (یعنی سند) سے
كُنْتُمْ :تم لوگ
وَمِنَ الْاِبِلِ :اور اونٹ میں سے
وَمِنَ الْبَقَرِ :اور گائے میں سے
قُلْ : آپؐ پوچھئے
حَرَّمَ : اُس نے حرام کیا
الْاُنْثَيَيْنِ : دو مؤنث کو
اشْتَمَلَتْ :لپٹیں
اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ : دو مؤنث کی بچہ دانیاں
كُنْتُمْ :تم لوگ
اِذْ :جب
اللّٰهُ :اللہ نے
فَمَنْ :پس کون
مِمَّنِ :اس سے جس نے
عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر
لِّيُضِلَّ :تاکہ وہ گمراہ کرے
بِغَيْرِ عِلْمٍ :کسی علم کے بغیر
اللّٰهَ :اللہ
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والے گروہ کو

اثْنَيْنِ :دو
ءٰالذَّكَرَيْنِ :کیا دو مذکر کو
اَمِ :یا
اَمَّا :یا اس کو
عَلَيْهِ :جس پر
نَبِّئُوْنِيْ :تم لوگ بتاؤ مجھ کو
اِنْ :اگر
صٰدِقِيْنَ :سچ کہنے والے ہو
اثْنَيْنِ :دو
اثْنَيْنِ :دو
ءٰالذَّكَرَيْنِ :کیا دو مذکر کو
اَمِ :یا
اَمَّا :یا اس کو
عَلَيْهِ :جس پر
اَمْ :یا
شُهَدَآءَ :موجود تھے
وَصّٰىكُمُ :تاکید کی تم کو
بِهٰذَا :اس کی
اَظْلَمُ :زیادہ ظالم ہے
افْتَرٰى :گھڑا
كَذِبًا :ایک جھوٹ
النَّاسَ :لوگوں کو
اِنَّ :بے شک
لَا يَهْدِي :ہدایت نہیں دیتا

نوٹ : اسراف کا مطلب ہے کسی بھی کام میں حد سے تجاوز کرنا۔ لیکن یہ دین اسلام کی ایک اصطلاح بھی ہے، جس کا مطلب ہے کسی جائز ضرورت پر ضرورت سے زائد خرچ کرنا۔ مثلاً کپڑا پہننا جائز ضرورت ہے۔ کسی کے پاس اگر دو، چار جوڑے کپڑے ہوں تو یہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن کسی کی الماری میں اگر اتنے جوڑے لٹکے ہوں کہ صبح کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آج کون سا جوڑا پہنا جائے تو یہ اسراف ہے۔

اسراف سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔اس میں ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جو شخص اپنی ضروریات پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرتا ہے' اس سے رشتہ داروں اور غریبوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے کوئی شخص اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے خود خالی ہو کر بیٹھ جائے تو وہ اپنے اہل وعیال کے اور خود اپنے نفس کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔اس لیے اسراف کسی بھی شکل میں ہو' وہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔

آیات ۱۴۵ تا ۱۵۰

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَى الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَایَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۫ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۴۷﴾ سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِیْنَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ع

ظ ف ر

ظَفَرَ یَظْفِرُ (ض) ظَفْرًا : چہرے پر ناخن مارنا۔

ظُفُرٌ (اسم ذات) : ناخن۔زیر مطالعہ آیت ۱۴۶۔

ظَفِرَ یَظْفَرُ (س) ظَفَرًا : مقصد میں کامیاب ہونا۔

اَظْفَرَ (افعال) اِظْفَارًا : کامیاب کرنا' غالب کرنا۔﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ (الفتح:۲۴)

''اس کے بعد کہ اُس نے غالب کیا تم کو ان پر۔''

ش ح م

شَحَمَ یَشْحَمُ (ف) شَحْمًا : چربی کھلانا۔

شَحْمٌ (اسم جنس بھی ہے) : واحد شَحْمَةٌ جمع شُحُوْمٌ : چربی۔زیر مطالعہ آیت ۱۴۶۔

ح وی

حَوٰی یَحْوِیْ (ض) حَوَایَةً : جمع کرنا' قبضہ کرنا۔

حَوِیٌّ مؤنث حَوِیَّةٌ (جمع حَوَایَا) : چھوٹا حوض' انتڑی۔زیر مطالعہ آیت ۱۴۶۔

حَوًی : سبزی مائل سیاہ ہونا۔

اَحْوٰی (افعل الوان وعیوب ہے): سبزی مائل سیاہ۔﴿فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی۝۵﴾ (الاعلیٰ) ''پھر اس نے کر دیا اس کو سیاہ کوڑا۔''

ہ ل م

ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

هَلُمَّ (اسم فعل): (۱) حاضر کرو، لے آؤ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۵۰۔ (۲) چلے آؤ۔﴿وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا﴾ (الاحزاب:۱۸) ''اور کہنے والے اپنے بھائیوں سے چلے آؤ ہماری طرف۔''

ترکیب

(آیت ۱۴۵) ''مَيْتَةً، دَمًا مَّسْفُوْحًا، لَحْمَ خِنْزِيْرٍ'' اور ''فِسْقًا'' یہ سب ''يَكُوْنُ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ ''فِسْقًا'' نکرہ مخصوصہ بھی ہے اور ''اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' اس کی خصوصیت ہے۔ ''غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'' حال ہیں اس لیے ''غَيْرَ'' پر نصب آئی ہے۔ (آیت ۱۴۶) ''حَمَلَتْ'' کا مفعول ''مَا'' ہے جبکہ ''ظُهُوْرُهُمَا'' اور ''اَلْحَوَايَا'' اس کے فاعل ہیں۔ (آیت ۱۴۸) ''تُخْرِجُوْا'' فعل امر نہیں ہے۔ اگر فعل امر ہوتا تو ''اَخْرِجُوْا'' آتا۔ یہ مضارع ''تُخْرِجُوْنَ'' تھا جو فاسیہ کی وجہ سے حالت نصب میں آیا ہے۔ ''اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ'' مبتدأ مؤخر ہے اور ''لِلّٰهِ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔ ''يَعْدِلُوْنَ'' کا مفعول ''غَيْرَ اللّٰهِ'' محذوف ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے	لَّآ اَجِدُ : میں نہیں پاتا
فِيْ مَآ : اس میں جو	اُوْحِيَ : وحی کیا گیا
اِلَيَّ : میری طرف	مُحَرَّمًا : حرام کیا ہوا
عَلٰى طَاعِمٍ : کسی کھانے والے پر	يَّطْعَمُهٗٓ : وہ کھاتا ہے جس کو
اِلَّآ اَنْ : سوائے اس کے کہ	يَّكُوْنَ : وہ ہو
مَيْتَةً : کوئی مردہ	اَوْ : یا
دَمًا مَّسْفُوْحًا : بہایا ہوا خون	اَوْ : یا
لَحْمَ خِنْزِيْرٍ : سور کا گوشت	فَاِنَّهٗ : پس بے شک یہ
رِجْسٌ : نجاست ہے	اَوْ : یا
فِسْقًا : ایسی نافرمانی	اُهِلَّ : (کہ) پکارا گیا
لِغَيْرِ اللّٰهِ : غیر اللہ کے لیے	بِهٖ : جس پر
فَمَنِ : پھر جو	اضْطُرَّ : مجبور کیا گیا

غَيْرَ بَاغٍ : بغیر باغی ہوتے ہوئے

فَاِنَّ : تو بے شک

غَفُوْرٌ : بے انتہا بخشنے والا

وَعَلَى الَّذِيْنَ : اور ان لوگوں پر جو

حَرَّمْنَا : ہم نے حرام کیا

وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ : اور گائے اور بکری میں سے

عَلَيْهِمْ : ان پر

اِلَّا مَا : سوائے اس کے جس کو

ظُهُوْرُهُمَآ : دونوں کی پیٹھوں نے

الْحَوَايَآ : انتڑیوں نے

مَا : وہ جو

بِعَظْمٍ : کسی ہڈی سے

جَزَيْنٰهُمْ : ہم نے بدلہ دیا

وَاِنَّا : اور بے شک ہم

فَاِنْ : پھر اگر

فَقُلْ : تو آپؐ کہہ دیں

ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ : وسیع رحمت والا ہے

لَا يُرَدُّ : نہیں لوٹائی جائے گی

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ : جرم کرنے والے گروہ سے

اَشْرَكُوْا : شریک بنائے

شَآءَ : چاہتا

مَآ اَشْرَكْنَا : تو ہم نہ شریک بناتے

وَلَا حَرَّمْنَا : اور ہم حرام نہ کرتے

كَذٰلِكَ : اس طرح

وَّلَا عَادٍ : اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہوتے ہوئے

رَبَّكَ : آپؐ کا رب

رَّحِيْمٌ : ہمیشہ رحم کرنے والا ہے

هَادُوْا : یہودی ہوئے

كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ : سب ناخن والے (جانوروں کو)

حَرَّمْنَا : ہم نے حرام کیا

شُحُوْمَهُمَآ : دونوں کی چربی کو

حَمَلَتْ : اٹھایا

اَوِ : یا

اَوْ : یا

اخْتَلَطَ : رل مل گئی

ذٰلِكَ : یہ

بِبَغْيِهِمْ : ان کی سرکشی کا

لَصٰدِقُوْنَ : یقیناً سچ کہنے والے ہیں

كَذَّبُوْكَ : وہ جھٹلائیں آپؐ کو

رَبُّكُمْ : تم لوگوں کا رب

وَ : اور (یعنی مگر)

بَاْسُهٗ : اس کی سختی

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ : وہ لوگ کہیں گے جنہوں نے

لَوْ : اگر

اللّٰهُ : اللہ

وَلَآ اٰبَآؤُنَا : اور نہ ہی ہمارے آباء واجداد

مِنْ شَيْءٍ : کسی بھی چیز کو

كَذَّبَ : جھٹلایا

الَّذِیْنَ : انہوں نے جو
حَتّٰی : یہاں تک کہ
بَاْسَنَا : ہماری سختی کو
هَلْ : کیا
مِّنْ عِلْمٍ : کوئی بھی علم (سند) ہے
لَنَا : ہمارے لیے
اِلَّا : مگر
وَاِنْ اَنْتُمْ : اور تم لوگ نہیں ہو
تَخْرُصُوْنَ : اٹکل لگاتے ہو
فَلِلّٰهِ : پس اللہ ہی کے لیے ہے
فَلَوْ : پھر اگر
لَهَدٰىكُمْ : تو ضرور ہدایت دیتا تم لوگوں کو
قُلْ : آپؐ کہیے
شُهَدَآءَ كُمُ : اپنے گواہوں کو
يَشْهَدُوْنَ : گواہی دیتے ہیں
اللّٰهَ : اللہ نے
هٰذَا : اس کو
شَهِدُوْا : وہ گواہی دیں
مَعَهُمْ : ان کے ساتھ
اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ : ان کی خواہشات کی جنہوں نے
بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
لَا يُؤْمِنُوْنَ : ایمان نہیں لاتے
وَهُمْ : اور وہ لوگ
يَعْدِلُوْنَ : برابر کرتے ہیں (غیر اللہ کو)

مِنْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے تھے
ذَاقُوْا : انہوں نے چکھا
قُلْ : آپؐ پوچھئے
عِنْدَكُمْ : تم لوگوں کے پاس
فَتُخْرِجُوْهُ : کہ تم لوگ نکال سکو اس کو
اِنْ تَتَّبِعُوْنَ : تم لوگ پیروی نہیں کرتے
الظَّنَّ : گمان کی
اِلَّا : سوائے اس کے کہ
قُلْ : آپؐ کہیے
الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ : پہنچنے والی حجت
شَآءَ : وہ چاہتا
اَجْمَعِیْنَ : سب کے سب کو
هَلُمَّ : لے آؤ
الَّذِیْنَ : جو لوگ
اَنَّ : کہ
حَرَّمَ : حرام کیا
فَاِنْ : پھر اگر
فَلَا تَشْهَدْ : تو آپؐ گواہی مت دیں
وَلَا تَتَّبِعْ : اور آپؐ پیروی مت کریں
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
وَالَّذِیْنَ : اور ان لوگوں کی جو
بِالْاٰخِرَةِ : آخرت پر
بِرَبِّهِمْ : اپنے رب کے

نوٹ: آیت ۱۴۸ میں اسی پرانے عذر کی نشاندہی کی گئی ہے جو ہمیشہ سے مجرم اور غلط کار لوگ پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیت یہی ہے کہ ہم شرک کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام ٹھہرا رکھا ہے' انہیں حرام ٹھہرائیں۔ ورنہ اگر اللہ نہ چاہتا کہ ہم ایسا کریں تو کیوں کر ممکن تھا کہ یہ افعال ہم سے صادر ہوتے؟ چونکہ ہم اللہ کی مشیت کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں' اس لیے ہم ایسا ہی کرنے پر مجبور ہیں۔

اس عذر کے جواب میں پہلی بات یہ فرمائی کہ اپنی گمراہی کے لیے مشیتِ الٰہی کو معذرت کے طور پر پیش کرنا

اور اسے بہانہ بنا کر صحیح رہنمائی قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا قدیم شیوہ رہا ہے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ تباہ ہوئے اور حق کے خلاف چلنے کا برا نتیجہ انہوں نے دیکھ لیا۔

پھر فرمایا کہ یہ عذر جو تم پیش کر رہے ہو یہ دراصل کسی حقیقی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض گمان اور تخمینہ ہے۔ تم نے محض مشیت کا لفظ کہیں سے سن لیا اور اس پر قیاسات کی ایک عمارت کھڑی کر لی۔ تم نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مشیت کیا ہے۔ تم مشیت کے معنی یہ سمجھ رہے ہو کہ چور اگر مشیت الٰہی کے تحت چوری کر رہا ہے تو وہ مجرم نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کے حق میں اللہ کی مشیت یہ ہے کہ وہ شکر اور کفر، ہدایت اور گمراہی، اطاعت اور نافرمانی میں سے جو راہ بھی اپنے لیے منتخب کرے گا، اللہ تعالیٰ وہی راہ اس کے لیے کھول دے گا۔ پھر غلط یا صحیح، جو کام بھی انسان کرنا چاہے گا، اللہ تعالیٰ اپنی عالمگیر مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جس حد تک مناسب سمجھے گا، اسے اس کام کی اجازت اور توفیق بخش دے گا۔ لہٰذا اگر تم نے اور تمہارے باپ دادا نے مشیتِ الٰہی کے تحت شرک کرنے اور حلال کو حرام کرنے کا جرم کیا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ تم اپنے اعمال کے ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔ اپنے غلط انتخابِ راہ کے ذمہ دار تو تم خود ہو۔ (تفہیم القرآن)

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی فکر انگیز تالیفات

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مجلد 400 روپے، غیر مجلد 200 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

ایمان اور فلسفۂ ابتلاء وآزمائش

پروفیسر توقیر عالم فلاحی ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان اور ان کے تمام موجودات کو انسانوں کے لیے بنایا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مخدومِ کائنات ہے اور تمام مخلوقاتِ ارضی وسماوی بے چون وچرا اس کی خدمت کررہی ہیں۔ انسان کی عظمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آسمانوں کی زینت [1] چاند، سورج اور ستاروں کی شکل میں ہو یا زمین کی زینت [2] نباتات، جمادات یا حیوانات کی شکل میں ہو، یہ سب کائنات کے اصل امتحان دہندہ اور اشرف المخلوقات انسان کے لیے ہیں تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں آزمائے کہ کون اطاعت وفرمانبرداری کا عہد نبھاتا ہے اور کون انحراف وبغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۟ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (المُلک)

''نہایت بزرگ وبرتر ہے وہ ذات جس کے اختیار میں (اس کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔''

انسانوں میں کون احسان منداور کون شکرگزار ہے اور کون احسان فراموش اور ناشکرا ہے، کائنات کی تمام نعمتوں کا وجود اور خدائے رحمٰن ورحیم کی ودیعت کردہ نعمتوں سے مالا مال انسان کی تخلیق کی غرض وغایت یہی ہے کہ کردار وعمل کے لحاظ سے انہیں پرکھا جائے۔ ایک جگہ واضح الفاظ میں انسانوں کی تخلیق کے اس مقصد کو واشگاف کیا جاتا ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا ۢ بَصِیْرًا ۝ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝﴾ (الدھر)

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا، وہ شکر کرنے والا ہے یا کفر کرنے والا۔''

ایک جگہ خلیفۃ اللہ یا نائب کی حیثیت سے انسانوں کے مقام کی تذکیر کرائی جاتی ہے اور آپس کے فرق ومراتب کی مصلحت بیان فرمائی جاتی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ towqueer@yahoo.in

اٰتٰىكُمْ ؕ﴾ (الانعام:۱۶۵)

''اور وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا' اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیئے' تاکہ اُس نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔''

انسان کی سب سے بڑی شکر گزاری یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے' اس طور پر کہ وہ اپنی ذات میں اکیلا ہے' نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے'(۳) وہ سرچشمہ صفات ہے اور اس جیسی صفات یا کوئی ایک صفت دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی میں نہیں ہے'(۴) اور یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ آسمان و زمین کی ملکیت اُسی کے لیے ہے۔ اگر وہ کسی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ساری دنیا مل کر بھی اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتی اور اگر وہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو دنیا کی ساری طاقت جھونک دی جائے تو بھی اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ اگر اللہ پر ایمان ہے تو انسان کا ہر نیک عمل عملِ صالح بن جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کی اللہ کی بارگاہ میں قدر افزائی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگ سعادت مند اور خوش نصیب ہوتے ہیں اور قرآن کی زبان میں خیر البریہ (بہترین خلائق) سے ملقب ہوتے ہیں۔ ان کی بابت اللہ ربّ العزت کی بشارت سنیے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝﴾ (البیّنة)

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ (صلہ) اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔''

ہر خطہ ارض کے لوگ رنگ و نسل' نسب و برادری' شان و شوکت اور قوت و اقتدار کے لحاظ سے چاہے جتنے اعلیٰ و ارفع ہوں' اگر ایمان نہیں ہے تو وہ خسارے میں ہیں' اور زیورِ ایمان سے آراستہ اور اعمالِ صالحہ سے مزین افراد ہی کامیاب و کامران ہیں۔ اس سلسلے میں زمانے کو شاہد بنا کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾ (العصر)

''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے' اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔''

کتاب اللہ میں ایک جگہ عمل صالح کو ایمان سے مشروط قرار دیا گیا اور اس کے نتیجے میں عمدہ اور خوشگوار زندگی کی ضمانت دی گئی۔ فرمایا جاتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۷﴾ (النحل)

''جوکوئی بھی نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ وہ مؤمن ہو' ہم یقینی طور پر اسے (دنیا میں) خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو لازماً ان کے کیے کا بہتر اجر دیں گے۔''

ایمان سب سے بڑی شکر گزاری سے موسوم ہے۔ اس کی موجودگی میں اچھے اور نیک اعمال اللہ رب العزت کی نگاہ میں شرفِ قبولیت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یہی اعمالِ صالحہ میزان عمل میں معتبر اور وزنی قرار پاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل کفر یا شرک بڑی ناشکری بلکہ اللہ سے کھلّم کھلا بغاوت کا نام ہے۔ حالت کفر میں چاہے بڑے بڑے اسکول اور کالج بنا دیے جائیں' دیدہ زیب مدرسے اور مکتب قائم کر دیے جائیں' معیاری طرز کے مسافر خانے اور شفاخانے تعمیر کر دیے جائیں' غرضیکہ کوئی بھی نیک عمل خواہ کتنا ہی بڑا ہو' اللہ کے یہاں نا قابل قبول ہوتا ہے اور میزانِ عمل میں بے وقعت اور بے وزن ہو جاتا ہے۔ کفر کی حالت میں جو اچھے اعمال کیے جاتے ہیں وہ آخرت کے بازار میں مثل سراب کے ہوں گے۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے نیک اعمال کی بڑی عبرت ناک تمثیل پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ﴾ (النور: ۳۹)

''اور جنھوں نے کفر کیا' ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا' مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا' بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا۔''

کفر کرنے والے اللہ کے بڑی باغی ہوتے ہیں۔ انہیں حِزْبُ الشَّيْطٰنِ (۵) ''شیطان کی جماعت'' سے بھی قرآن نے موسوم کیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ کی کتاب بدترین مخلوق قرار دیتی ہے اور ان کا ابدی ٹھکانہ جہنم قرار دیتی ہے۔ ربّ السمٰوات والارض کا یہ ارشاد سنیے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶﴾ (البینة)

''اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے' وہ یقیناً جہنم کی آگ میں ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔''

جب ایمان اتنی بیش قیمت دولت ہے کہ جس کے بغیر کوئی بھی نیک عمل اعمالِ صالحہ میں شمار نہیں ہوتا اور اس پر اجر کی امید رکھنا امر موہوم' بے حقیقت بلکہ سنگین فریب ہے' تو یہ بڑا سنجیدہ موضوع بن جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی بھلائی کے خواہاں اور متمنی ہر ذی ہوش کو حقیقتِ ایمان سے واقفیت کے لیے فکر مند ہو جانا چاہیے تاکہ اعمالِ صالحہ کی قبولیت کے سلسلے میں خدشات وخطرات کے بادل اُمڈتے نظر نہ آئیں۔ حقیقت ایمان سے واقفیت کے لیے قرآن کریم ہی ہمارے لیے مصدرِ اول اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ چند آیاتِ کریمہ اس غرض سے حوالہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

شک وریب اور تذبذب وتردّد کی کیفیت ایمان کے متضاد ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا.....﴾ (الحجرات:۱۵)

''مؤمن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے.....''

خشک وتر' نرم وگرم اور موافق وناموافق' تمام احوال میں بندۂ مومن سے استقامت و پامردی کا تقاضا ہوتا ہے۔ایمان کے لوازم میں سے یہ ہے کہ موقع پرستی اور مفاد پر مبنی وقتی اقدامات سے گریز کیا جائے۔جیسا کہ فرمایا جاتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا.....﴾ (حٰمٓ السجدة:۳۰)

''جن لوگوں نے کہا' ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے.....''

اہل ایمان حقیقت میں وہ ہیں جو مال ودولت' کرسی واقتدار اور اولاد واحفاد سے بے جا محبت نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسباب واحوال اور ازواج واولاد کی محبت اللہ کی محبت پر غالب نہیں آتی' بلکہ اللہ کی محبت دنیا ومافیہا کی محبت پر غالب ہوتی ہے۔ایمان والوں کی یہ لازمی صفت ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرة:۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

بے چون وچرا اللہ ورسول کو قانون ساز اور حَکم تسلیم کرنا اور اللہ ورسول کے فیصلوں سے متعلق کسی قسم کی تنگی یا کبیدگی محسوس نہ کرنا بھی ایمان کے لوازم میں ہے۔قرآن مجید کی اس آیت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلوں کی عظمت طشت از بام ہوتی ہے اور مؤمن کے سامنے اس سلسلے میں قطعی اور حتمی لائحہ عمل سامنے آتا ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾﴾ (النساء)

''پس نہیں' (اے نبی ﷺ!) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مؤمن نہیں ہیں جب تک وہ اپنے باہمی اختلافات میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ پوری طرح سر اطاعت جھکا دیں۔''

محض زبانی اقرار سے ایمان کی عظمت واضح نہیں ہوتی۔'لا الٰہ الا اللہ' محض زبان پر ہو اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل نہ ہو تو گویا ایمان دراصل دل کی دنیا میں اپنی جگہ نہیں بنا سکا ہے' اس لیے کہ ایمان کی تخم ریزی اگر بندۂ خدا کے قلب میں ہوگئی ہے تو اس کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے' یہاں تک کہ ایمان جب شجرِ طیّب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو پھر ہر عمل مؤمن کے قول کی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔

ایمان کی حقیقت سے متعلق قرآن مجید کی یہ ہدایت بڑی اہم اور قابلِ التفات ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾ (الحجرٰت)

''یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ان سے کہو کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہوگئے

اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اختیار کرلو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔''

قول اور عمل میں تضاد دراصل ایمان میں اخلاص کے نہ ہونے کے سبب ہوتا ہے۔ اگرچہ اس طریقہ عمل میں بندۂ خدا دنیا کی اس زندگی میں عافیت کی راہ کا راہی بنتا نظر آتا ہے' اس کے خلاف مزاحمت و مخالفت کا ماحول گرم نہیں ہوتا' مصیبتیں اور مشکلات رفع ہوتی نظر آتی ہیں' لیکن قرآن مجید اسے نفاق سے تعبیر کرتا ہے' اس کی شخصیت پر دھندلکے چھا جاتے ہیں' انفرادیت اور تشخص اس کا باقی نہیں رہتا۔ اس کردار کے حاملین کے لیے معاشرۂ انسانی کے دل میں جگہ نہیں ہوتی اور وہ اس کردار کی بنا پر موقع پرست' عیّار اور مکّار کی حیثیت سے بھی لوگوں میں جانا جاتا ہے۔ اللہ ربّ العزت کے نزدیک یہ کردار بہت گھناؤنا ہوتا ہے۔ اس کردار کی سنگینی اس آیت شریفہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصف)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔''

ایمان و اخلاص کے متضاد اس حرکت و عمل کے انتہائی شنیع اور سنگین جرم ہونے کا اندازہ اس آیت کریمہ سے بھی ہوتا ہے جس میں اس کردار کے نمائندوں کو بطور سزا انتہائی اذیت ناک جہنم کی وعید سنائی جاتی ہے:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (النساء:۱۴۵)

''یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نیچے (اذیت ناک) طبقے میں ہوں گے۔''

ایمان و اخلاص سے محروم رہنے والا شخص خواہ وہ کافر ہو یا مشرک یا منافق' دراصل بنیادی طور پر اس فکر و خیال کا متحمل ہوتا ہے کہ اللہ واحد کے سوا بھی دنیا میں بہتیرے اشخاص و افراد اور اسباب و عوامل فائدہ اور نقصان کے مالک ہوتے ہیں۔ اللہ' رسول اور آخرت پر ایمان لانے والا شخص صرف اور صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔ شعور کی گہرائی سے وہ اس بات کا قائل ہی نہیں بلکہ علمبردار ہوتا ہے کہ ایک ذرہ سے لے کر پہاڑ تک' سب پر اُسی ذاتِ واحد کی حکمرانی ہے اور سب کا وجود اس کے مرہونِ منت ہے۔ اس لیے وہ رسول ﷺ کے ذریعہ لائی گئی تعلیمات پر ایمان رکھتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی پر اسے حق الیقین ہوجاتا ہے۔ اپنے آپ کو اگر وہ ذمہ دار اور جوابدہ سمجھتا ہے تو صرف اور صرف مولائے حقیقی کے سامنے' اسی لیے وہ ڈرتا بھی اُسی سے ہے۔ قرآن حکیم میں سینکڑوں مقامات پر اُسی سے ڈرنے اور اُسی کا ہوکر رہنے کی تلقین فرمائی جاتی ہے۔ (۶)

ایمان کا اولین اور اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ صرف اور صرف اللہ کی ذات سے ڈرا جائے۔ اللہ کے علاوہ جتنے بھی خودساختہ خدا ہیں' خواہ کسی منصب و اقتدار کی شکل میں ہوں' نفس اور مفاد کی شکل میں ہوں' رنگ و نسل کی شکل میں ہوں' علاقائیت اور برادری کی شکل میں ہوں یا پھر مکتبہ فکر اور مسلک کی شکل میں ہوں' یہ سب شیطان کے احباب و رفقاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے صاف صاف یہ کہتا ہے کہ اگر ایمان کے مدعی ہو اور اس میں

تم مخلص ہو تو اس کا تقاضا ہے کہ صرف مجھ سے ڈرو! یہ واضح فرمانِ خداوندی ایمان والوں کو لائحہ عمل دے رہا ہے:

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ﴾ (آل عمران:۱۷۶)

''وہ تو محض شیطان ہے جو اپنے احباب سے تم کو ڈراتا ہے۔ تم ان سے ہرگز نہ ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرو اگر تم حقیقت میں ایمان والے ہو۔ جو لوگ کفر کی راہ میں سرگرمی دکھا رہے ہیں' یہ تمہیں غم زدہ نہ کر دیں۔ یہ اللہ کا ہرگز کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

اللہ کے خوف و ڈر کو قرآن نے تقویٰ کے جامع لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اگر دلوں پر اُس کی حکمرانی ہو جائے تو رات کی تاریکی میں بھی اور دن کی روشنی میں بھی' تنہائی میں بھی اور جم غفیر میں بھی' بند کمرے اور چہار دیواری میں بھی' سڑکوں اور شاہراہوں پر بھی' آبادی میں بھی اور صحرا میں بھی' ہر جگہ انسان کے لیے یہ تقویٰ یا خدا کا ڈر ایک ضابط و حکمران ثابت ہوتا ہے۔ اور چوں کہ یہ انسان کے دل پر حکمران ہوتا ہے اسی لیے انسان اندر سے بدل جاتا ہے اور ہر جگہ مرضیٔ مولا کے حصول میں متحرک اور سرگرم عمل رہتا ہے۔ دل و دماغ پر تقویٰ کی حکمرانی کے بعد وہ جری اور بہادر ہو جاتا ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کا ڈر اس کے اندر سے کافور ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کا ہو کر رہتا ہے۔ یہی تقویٰ دنیا میں رہتے ہوئے اسے توشہ آخرت کی فراہمی کا روح پرور اور مؤثر سبق سکھاتا ہے۔

خوفِ خدا سے زندگیوں کو مزیّن کرنے کی تلقین ایک جگہ ایک ہی آیت کریمہ میں دو بار ہوتی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (الحشر)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان بھیج رکھا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال سے خوب باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔''

پُرخار راہوں اور سنگلاخ وادیوں کو سر کرنے کے بعد ہی مرضیٔ مولا کے حصول کی منزل تک رسائی ہوتی ہے۔ یہ سعادت و سرخروئی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب ایک بندۂ مؤمن مصائب و شدائد کی بھٹیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ انسان نما خونخوار بھیڑیے اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور اذیت ناک روح فرسا احوال پیش کر کے اس کو اپنے موقف سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں بندۂ مومن سے استقامت کا مطالبہ ہوتا ہے۔ خدا کے معزز ترین فرستادوں اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کی تاریخ ہے کہ انسانیت کش اور دلدوز حالات پیدا کر کے اللہ کے ان رسولوں اور معزز ترین بندوں کو موقف سے روکنے کی کوشش کی گئی ہے' لیکن اس میں بھی صداقت ہے کہ باطل کے علمبرداروں نے منہ کی کھائی ہے اور اہل حق فتح مند اور سرخرو ہوئے ہیں۔

آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سالہ دعوت اور اس کے نتیجے میں قوم کے اوباشوں کا سلوک و برتاؤ' موحد اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نمرود اور اس کی قوم کے ظلم و جارحیت کا لامتناہی سلسلہ' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف سے طوفانِ بدتمیزی اور ایذا رسانی کا غیر مختتم وقوعہ' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قوم کا قابل مذمت برتاؤ اور سولی پر لٹکا دینے کی سازش اور اسی راہ حق میں حضرت زکریا'

حضرت یحییٰ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ سفاکیت اور درندگی کا مظاہرہ' یہ سب تاریخی حقائق ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ مصائب ومشکلات اس راہِ حق کا توشہ ہیں اور اللہ کی جنت شدائد ومحن کے ریگ زاروں اور صبر آزما مراحل سے گزرتے ہوئے ملتی ہے۔ ایمان والوں کو جنت کی راہ بتائی جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرہ: ۲۱۴)

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (یوں ہی) جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے اہل ایمان ساتھی چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی!''

ایمان والوں سے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت وتائید کا وعدہ کیا ہے اور آج بھی اہل ایمان سے وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان کے زیور سے آراستہ ہوں گے اور ان کے تقاضوں کو بے چون وچرا پورا کر رہے ہوں گے' ان کو اللہ کی تائید ونصرت ملے گی۔ ایمان والوں کو بشارت کی شکل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ وعدہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ﴾ (النور: ۵۵)

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے' ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔''

نصرتِ خداوندی اور تائیدِ الٰہی کی سنت کو اللہ کی کتاب ایک جگہ یوں واضح کرتی ہے:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾﴾ (المؤمن)

''بالیقین ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اُس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت ہوگی اور ان کے لیے بدترین ٹھکانہ ہوگا۔''

اللہ کی نصرت کا یہ اعزاز ان سعید اور مبارک روحوں کے حصے میں آتا ہے جو ایمان کی راہ میں ابتلاء وآزمائش کو لابدی حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ خاطر رہتے ہیں۔ تائید ونصرت کی سنّتِ الٰہی میں یقیناً کوئی تغیّر وتبدّل نہیں ہے۔(۷) لیکن اس کی آزمائش کی سنّت بھی اتنی ہی مضبوط' مستحکم اور یقینی ہے۔ ان ربّانی فرمودات کو ملاحظہ فرمائیے:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝۳﴾ (العنکبوت)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا' حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ چنانچہ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون!''

یوں تو اللہ تبارک وتعالیٰ عام لوگوں کو دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندہ مال و دولت' عزت و جاہ اور کرسی و اقتدار پا کر انانیت اور تکبر کے اظہار کے ذریعہ چھچھورے پن کا تو مظاہرہ نہیں کرتا اور ناشکر گزار بندوں کے زمرے میں تو نہیں آتا' اور لے کر آزماتا ہے کہ وہ رحمت خداوندی سے مایوس ہو کر تھڑدلے پن کا تو مظاہرہ نہیں کرتا اور اس کے پایۂ استقامت میں لغزش تو نہیں آتی۔ لیکن تاریخی حقیقت ہے کہ بالعموم جو اللہ سے جتنا قریب ہوا' اس کی اتنی ہی آزمائش ہوئی اور وہ مبتلائے مصیبت کیا گیا۔ ہاں آخر میں ناموری' شہرت' اقتدار اور حکومت کی شکل میں انہیں دنیا بھی حَسَنَة کے طور پر دی گئی اور وہ شاد کام و سرخرو ہوئے۔ ایمان والوں کو اس بات پر بھی یقین ہونا چاہیے کہ اس راہ میں مشکلات اور ناخوشگوار حالات سے سابقہ پڑے بغیر اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کے فضل و کرم کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ گویا ابتلاء و آزمائش کامیابی و سرخروئی کی راہ کا توشہ ہے۔ اس سلسلے میں اللہ ربّ العزت کی یہ یقین دہانی آج کے حالات میں زخموں کا مرہم اور مایوسی و قنوطیت کے مرض کا تریاق ہے۔ فرمان سنیے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾

(البقرۃ:۱۵۵)

''اور ہم کسی قدر خوف و خطر' فاقہ کشی' جان و مال اور پھلوں میں نقصان کے ذریعہ ضرور تمہیں آزمائیں گے۔''

کلمہ طیبہ کے مقدس الفاظ جب دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں اور پورے یقین کے ساتھ زبان پر آتے ہیں تو مخاطب معاشرہ کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز کو دبانے کے لیے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور سازشیں کی جاتی ہیں۔ ''لَا اِلٰہ'' کے الفاظ کلمہ کا پہلا جزو ہے جس کے ذریعہ دنیا میں رائج ہر طرح کی خدائیوں کا انکار ہوتا ہے۔ آباء و اَجداد کے دین کی اندھی تقلید اور ضد و ہٹ دھرمی کے پیکر' تکبر و عناد کے رسیا' اوہام و خرافات میں گرفتار اور خود ساختہ خداؤں کے پرستار کبھی بھی اس آواز کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک معبودان باطل کا انکار نہیں کیا جائے گا معبود حقیقی کا اعتراف و اعلان بلکہ ایمان و ایقان مہمل اور بے سود ہوگا۔ گویا ''اِلَّا اللّٰہ'' (صرف اللہ) کی آواز اُسی وقت معتبر ہو سکتی ہے جب کہ ''لَا اِلٰہ'' (معبودانِ باطل کا انکار) کا اعلان پورے شعور کے ساتھ دوٹوک انداز میں کیا جائے۔

گویا اچھائی یا نیکی اس وقت تک اچھائی یا نیکی نہیں ہوتی جب تک اس کی ضد برائی یا بدی کو برائی اور بدی نہ کہا جائے۔ روشنی' صحیح معنوں میں اپنا وجود تسلیم نہیں کراتی جب تک تاریکی کو زوردار انداز میں رد نہ کیا جائے۔ اسی طرح حق' حق نہیں ہو سکتا جب تک باطل کو پوری قوت کے ساتھ باطل نہ کہا جائے۔ اُمتِ مسلمہ کے

افراد ہونے کی حیثیت سے امر بالمعروف (نیکی کا حکم دینا) اور نہی عن المنکر (بدی سے روکنا) کا فریضہ انجام دینا ہوگا' اس لیے کہ دعوت کا کام امت کی شناخت ہے۔ اگر ایک جماعت اس فریضے کی ادائیگی سے کوتاہ رہتی ہے تو گویا وہ جماعت اپنی انفرادیت وتشخّص کو مجروح کرتی ہے۔ ہاں نماز کی تعلیم' قرآن سے تعلق کی تذکیر اور دیگر عبادات کی انجام دہی کی تلقین وغیرہ بلاشبہ دعوت الی اللہ کے زمرے میں ہیں' لیکن بدی وبرائی اور فحاشی وعریانیت کے خلاف قولی اور عملی شکل میں صدائے احتجاج' فتنہ پروری وبغاوت کے خلاف محاذ آرائی اور دیگر فواحش ومنکرات کے خلاف معرکہ آرائی بھی اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا معروفات اور نیکیوں کی دعوت دینا۔

ہاں سیئات ومنکرات کے خلاف اقدام وعمل میں بھی حکمت عملی کو بالائے طاق نہیں رکھا جائے گا' کیونکہ حکمت ودانائی داعی کے لیے ایک بڑی مؤثر تدبیر ہے (۸) اور یہ نعمت جسے مل گئی اسے گویا بیش قیمت دولت مل گئی۔ (۹) چنانچہ حکمت عملی یا عقل ودانائی کا استعمال کرتے ہوئے کبھی طاقت استعمال کی جائے گی' کبھی زبان استعمال کی جائے گی اور کبھی دل سے اس سے نفرت کی جائے گی اور کسی قسم کا نرم گوشہ اس برائی سے متعلق حاشیۂ دل میں کوئی جگہ نہ پائے گا۔ برائیوں سے روکنے سے متعلق یہ تینوں ذرائع بترتیب اول' دوم اور سوم درجے کے ایمان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کوئی ایمان کے تیسرے درجے پر بھی فائز نہیں ہے تو گویا رائی برابر بھی ایمان اس کے اندر نہیں ہے۔ (۱۰)

اچھائی کو اچھائی کہنا' یا کسی کو نیک کاموں کی طرف بلانا' دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے کسی کو کہنا' تلاوتِ قرآن کے اہتمام کی تلقین کرنا' اجتماعات اور جلسوں کا انعقاد کرنا' راہ خدا میں خرچ کرنے کی تذکیر کرنا' یہ کام بلاشبہ معروفات میں ہیں۔ بالعموم ہر شخص چاہے جس کردار کا حامل ہو' سننے سے گریز نہیں کرتا اور داعی کے خلاف منصوبوں اور سازشوں کا دام تیار نہیں کرتا' ہاں جب برائی کو برائی کہا جائے اور برائی کرنے والے کے خلاف احتجاج کیا جائے اور اس کو باز رکھنے کی کوشش کی جائے تو طاقت' زبان اور دلی نفرت' ان سب صورتوں میں مخالفت ناگزیر ہوجاتی ہے' بلکہ ایذارسانی سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ ابتلا وآزمائش کا سبق یہاں یاد کرنا پڑتا ہے اور ثباتِ قدمی اور استقلال کی تعلیمات انہی احوال وکوائف میں سودمند اور نفع بخش ہوتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نبوت سے قبل مخصوص انداز میں اللہ کی حمد وتسبیح اور عبادت میں مشغول ومنہمک تھے یا نبوت کے بعد جب تک مخفی انداز سے دین کا کام کرتے رہے تو آلام ومصائب آپؐ کے قریب نہیں پھٹکے' نہ ہی مخالفین کی مخالفتیں ہوئیں اور نہ ہی سازشوں کا جال بچھایا گیا' جگرخراش طعنے اور دلدوز دھمکیاں بھی آپؐ کو نہیں سننا پڑیں' لیکن پیغمبر انسانیت ﷺ کی تاریخ دعوت اس حقیقت پر گواہ ہے کہ جب آپؐ نے صفا کی بلندی پر چڑھ کر مخاطب معاشرہ کو متوجہ کیا اور قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا (تم لا الٰہ الا اللہ کہہ دو تو کامیاب وکامران ہوجاؤ گے) کے مقدس اور انقلابی کلمات جب اس کے کانوں میں گونجے تو عصبیت' جہالت اور تکبر کے خوابیدہ بت جاگ اٹھے۔ انہوں نے داعی اعظم اور محسن انسانیت ﷺ کے اس نسخۂ شفا کو آباء واَجداد کے تراشیدہ خداؤں (لات عزیٰ' منات اور ہبل) کے خلاف بغاوت اور اعلانِ جنگ قرار دیا۔ اب ابولہب' عتبہ' ولید' ابوجہل اور دیگر رؤسائے قریش آپؐ کے متشدّد حریف بن گئے اور دعوت' داعیٔ اعظم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے خلاف شمشیر برہنہ

ہو گئے۔ مخالفت اور عناد کے جو جو حربے اختیار کیے جا سکتے تھے' انہوں نے سب کو آزمایا' آپ کی نیتوں پر شبہ کیا گیا' سب وشتم کیا گیا' شعب ابی طالب کے قیدی بنائے گئے' سفاکیت اور درندگی کے مظاہرے کیے گئے' آپ ﷺ کے احباب ورفقاء گرم گرم ریتوں پر لٹائے گئے' سینوں پر پتھر رکھے گئے' سماجی مقاطعہ ہوا' فاقے کرنے پڑے' گھر بار اور زمین وجائیداد تک چھوڑنا پڑا۔ گویا اللہ کی راہ میں اللہ کے اس عظیم ترین نجات دہندہ اور اس کے احباب ورفقاء کو ابتلاء وآزمائش کی بھٹیوں سے گزرنا پڑا' جبھی یہ دعوت برگ وبار لائی اور تمام کروفر کے ساتھ خدا کی زمین پر جلوہ نما ہوئی اور اسی دنیا کے اندر محسن اعظم ﷺ کو مقام محمود (۱۱) اور آپؐ کے رفع ذکر (۱۲) اور آپؐ کی مغفرت (۱۳) کا چرچا اللہ ربّ العزت نے اپنی کتاب میں بطور اعزاز کر دیا اور آپؐ کے رفقاء کو اسی دار فانی میں ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' کی شکل میں ربّ کریم کی رضا کی سند مل گئی۔ (۱۴)

توحید کی علمبردار اُمت مسلمہ کے کاندھوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کا بار ہے۔ ہر فردِ اُمت اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق اس عظیم الشان فریضے کی انجام دہی کے لیے مکلّف ہے۔ معروفات اور حسنات کی تشہیر وتبلیغ کے ساتھ ہی ساتھ منکرات اور سیئات کا قلع قمع کرنے کی ذمہ داری بھی اس داعی امت پر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ دعوتِ دین کے اس سفر میں دشوار گزار مراحل آئیں گے' خطرات وخدشات کے بادل اُمڈتے دکھائی دیں گے' سازشیں کی جائیں گی' سختیاں جھیلنی پڑیں گی' فاقے کرنے پڑیں گے' لڑائیاں لڑنا پڑیں گی' اور خون بھی بہیں گے' لیکن اگر استقلال کا سرمایہ اور مشن سے محبت ہو اور پایہ ثبات میں لغزش نہ آئے تو ایسے لوگوں کو ربانی الطاف وعنایات کی نوید سنائی جاتی ہے اور راہ یاب وہدایت یافتہ ہونے کا مژدۂ جاں فزا بھی انہیں ملتا ہے:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۵ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۷﴾ (البقرۃ)

''اور خوشخبری دے دیجیے ان لوگوں کو جو مصیبت آنے پر صبر کریں اور کہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہمیں واپس جانا ہے۔ یہی ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے عنایتیں ہوں گی اور اس کی رحمت کا سایہ ہوگا' اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔''

ترغیبات وتحریصات' خوشگوار وناخوشگوار احوال اور مثبت ومنفی رویوں کے باوجود اگر موقف پر استقامت وپامردی کا ثبوت دیا جاتا ہے تو اللہ ربّ العزت کی طرف سے تائید ونصرت کے طور پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے جو انہیں سعادتِ دارین کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ آیاتِ کریمہ سراپا تبشیر ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے' یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو' نہ غم کرو' اور اس جنت کی بشارت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ

کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا' جو مانگو گے وہ ملے گا (اور بطورِ اعزاز فرمایا جائے گا) یہ ہے سامانِ ضیافت' اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے۔''

کائنات میں انسان کی تخلیق امتحان و آزمائش کے مقصد سے ہوئی ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے اور پوری کائنات اس کی خدمت گار ہے۔ اس کی جانب سے ربّ السموات والارض کے لیے سب سے بڑی شکر گزاری یہ ہے کہ وہ ایمان کی روش پر گامزن ہو اور عمل صالح کا طریقہ اختیار کرے۔ یہی شکر گزاری اسے اللہ کی تیار کردہ نعمتوں کے باغات کا مستحق اور ابدی قیام گاہوں کا مکین بنا دیتی ہے۔ اس کے بالمقابل سب سے بڑی ناشکری یہ ہے کہ اللہ واحد کا انکار کیا جائے اور کفر کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی کو بے لگام کر دیا جائے۔ جہنم کے دہکتے ہوئے شعلے ایسے ناشکروں کا استقبال کرتے ہیں۔ ایمان جب زیورِ اخلاص سے آراستہ ہو تو قول و عمل میں توافق و ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایسا شخص اللہ واحد سے ہی ڈرتا ہے' اُسی کو معاملاتِ زندگی میں قولاً اور عملاً احکم الحاکمین تسلیم کرتا ہے' اللہ کی محبت اُس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور مال و اولاد بلکہ پوری دنیا کی محبت بھی اللہ کی محبت پر غالب نہیں آتی۔ تاریخ کی یہ ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ جن لوگوں نے جتنا بڑھ کر ایمان اور اللہ سے محبت کا دعویٰ کیا وہ آزمائش کی بھٹیوں میں تپائے گئے اور انہیں جانوں تک کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ مؤمن یا موحد صرف ایک اللہ کی اطاعت و عبدیت کا اعلان نہیں کرتا بلکہ وقت کے رائج خود ساختہ اور باطل خداؤں کا انکار بھی کرتا ہے۔ اگر صرف مثبت طریقے سے وہ اللہ واحد کا اقرار کرے اور معروفات و حسنات کا پیامی بنا رہے تو یقیناً مخالفتوں' سازشوں اور گھناؤنی حرکتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور زندگی عافیت سے گزرے گی' لیکن تقاضائے ایمان کی تکمیل اُس وقت تک نہ ہو سکے گی' جب تک باطل خداؤں کا بھی شد و مد سے انکار نہ کیا جائے اور خبائث و رذائل اور منکرات و سیئات کے خلاف محاذ آرائی نہ کی جائے۔ حق و باطل اور معروف و منکر سے متعلق اس طرح کے اقدامات یقیناً مخالفتوں کو دعوت دیتے ہیں' مشکلات اور مصائب کے دروازے کھول دیتے ہیں' سازشوں اور رذیل حرکتوں کے محرک بنتے ہیں' لیکن اس راہ میں ثبات و استقلال پر تائیدِ الٰہی شامل ہوتی ہے' فرشتوں کی مدد آتی ہے اور دنیا اور آخرت دونوں کے لیے نویدِ مسرت سنائی جاتی ہے۔

حوالے و حواشی:

(۱) ﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَۃِۨ الۡکَوَاکِبِ ۙ﴾ (الصّٰفّٰت)

''یقیناً ہم نے مزیّن کر دیا ہے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زیبائش سے۔''

(۲) ﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا﴾ (الکھف:۷)

''یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار۔''

(۳) ﴿لَمۡ یَلِدۡ ۙ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ﴾ (الاخلاص)

(۴) ﴿لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

''اس کی مثال کی سی بھی کوئی شے نہیں۔''

(۵) المجادلة:۱۹

(۶) بطور مثال ملاحظہ فرمایئے البقرة: ۱۸۹، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۰۳، آل عمران: ۱۰۲، ۱۲۳، ۱۳۰، ۱۳۱، النساء: ۱، ۱۳۱، المائدة: ۲، ۴، ۷، ۸، الانعام: ۱۵۵، الانفال: ۱، ۲۵، ۶۹، الشعراء: ۱۰۸، لقمان: ۳۳، الحدید: ۲۸۔

(۷) ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝۵۱﴾ (المؤمن)

''ہم لازماً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور اُن لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں بھی، اور اُس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔''

(۸) ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ .....﴾ (النحل:۱۲۵)

''آپؐ دعوت دیجیے اپنے ربّ کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ.....''

(۹) ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ﴾ (البقرة:۲۶۹)

''اور جسے حکمت عطا کر دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔''

(۱۰) صحیح مسلم، کتاب الایمان، عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ وعن عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۱۱) ﴿عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹﴾ (بنی اسرائیل)

''امید ہے کہ آپؐ کا ربّ آپؐ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔''

(۱۲) ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴﴾ (الم نشرح)

''اور ہم نے آپؐ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔''

(۱۳) ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح:۲)

''تاکہ اللہ بخش دے آپ کی کوتاہیاں جو پہلے ہوئیں اور جو بعد میں ہوئیں۔''

(۱۴) البیّنة :۸

❁❁❁

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

وجودِ باری تعالیٰ

نظریہ ہائے علم الکلام کی روشنی میں (۳)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ☆

خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل اس کی مخلوق ہے اور مخلوق میں بھی انسان اور کائنات۔ خدا کے وجود کے اثبات کا ایک طریقہ خدا سے مخلوق تک کے سفر کے مطالعہ کا ہے۔ فلسفہ' کلام اور تصوف میں خدا کے وجود کے اثبات کے ضمن میں یہی سوال زیر بحث رہا ہے کہ وحدت سے کثرت کیسے پیدا ہوئی ہے؟ خدا سے کائنات اور انسان کے وجود تک کے کیا مراحل ہیں؟ اس سوال کا جواب ایک تو نظریہ عرفان (The Theory of the Unity of Being) نے دیا کہ کثرت جو کہ نظر آ رہی ہے' وہ ایک دھوکا ہے اور حقیقت' وحدت ہے۔ پس موجود ہونے میں صرف وحدت ہی وحدت ہے' اور کثرت اس کے مظاہر ہیں۔ آسان الفاظ میں وحدت سے کثرت پیدا نہیں ہوئی بلکہ وحدت کا کثرت میں ظہور ہوا ہے۔ پس انسان اور کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے وجود کے مظاہر ہیں۔ دوسرا جواب فلاسفہ نے دیا کہ وحدت' کثرت کی علت ہے' یعنی خدا کی ذات عِلّة العِلل (First Cause) ہے۔ اور تیسرا جواب آسمانی مذاہب میں دیا گیا کہ خدا نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور آدم علیہ السلام سے انسان کی پیدائش کا آغاز فرمایا اور اسے نظریہ تخلیق کا نام دیا جاتا ہے۔

خدا کی ذات تک پہنچنے کا دوسرا طریقہ کار جو سائنس میں رائج رہا ہے' وہ کثرت سے وحدت کی طرف سفر کرنا ہے۔ یعنی آج کی تاریخ سے ماضی میں سفر کریں اور یہ جانیں کہ یہ انسان اس دنیا میں کہاں سے آ گیا' مریخ سے آیا ہے' آسمانوں سے ٹپکا ہے' کہاں سے آیا ہے؟ انسان کا موجود ہونا تو حقیقت ہے لیکن انسان کب سے اس دنیا میں ہے؟ قدیم انسان کی تاریخ (Ancient History)' علم الآثار (Archeology) اور علم الانسان (Anthropology) وغیرہ کی روشنی میں ماضی میں جا کر انسان کا مصدر (origion) معلوم کیا جائے۔ بائبل اگرچہ ایک مذہبی کتاب ہے لیکن ایک اور پہلو سے غور کیا جائے تو یہ کتاب قدیم انسان کی تاریخ پر قدیم ترین مآخذ میں سے ایک مستند ترین ماخذ ہے۔ پس اللہ کے کلام ہونے کے اعتبار سے تو اس کی تصدیق اور تکذیب میں احتیاط کا پہلو شامل ہے' لیکن ایک تاریخی واقعے کے بیان میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ ماقبل مسیح کا جس قدر تاریخی لٹریچر اس وقت انسانوں کے پاس محفوظ ہے' اس میں سے ایک مستند ترین تاریخی ماخذ تورات کا ہے۔

mzubair@citilahore.edu.pk ☆

قدیم انسان کی تاریخ

اہل تاریخ نے دُنیا کی تاریخ کومختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دورتو وہ ہے جسے ''ماقبل تاریخ رقدیم حجری دور'' (Paleolithic age) کہتے ہیں اور اس کا دورانیہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (Britannica) کے مطابق بیس سے پچیس لاکھ ماقبل مسیح سے لے کر بارہ ہزار ماقبل مسیح تک بتلایا جاتا ہے۔ دوسرا دور ''جدید حجری دور'' (Neolithicage) کہلاتا ہے کہ جس کا دورانیہ انسائیکلو پیڈیا ASPRO کے مطابق بارہ ہزار ماقبل مسیح سے ساڑھے چار ہزار یا ساڑھے تین ہزار ماقبل مسیح تک کا ہے۔ تیسرا دور ''کانسی کا دور'' (Bronze age) ہے جو کہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق تین ہزار ماقبل مسیح سے بارہ سو ماقبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے۔ چوتھا دور ''لوہے کا دور'' (Iron age) ہے جو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق بارہ سو ماقبل مسیح سے پانچ سو عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ اور پانچواں دور ''قرونِ وسطی'' (Middle ages) کا ہے جو انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ہی کے مطابق پانچ سو عیسوی سے پندرہ سو عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ اور آخری اور چھٹا دور ''دور جدید'' (Modern Age) ہے۔

یہ تو اہلِ تاریخ کا بیان ہوا' جبکہ مذہبی بیانیے کے مطابق قدیم انسان کی تاریخ ان پانچ ادوار میں منقسم قرار پاتی ہے۔[۱] پہلا دور آدم سے نوح' دوسرا نوح سے ابراہیم' تیسرا ابراہیم سے موسیٰ' چوتھا موسیٰ سے عیسیٰ (علیہم السلام) اور پانچواں عیسیٰؑ سے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہے۔ اس تاریخ کے مطابق آدم علیہ السلام کو جنت[۲] سے ''ارضِ ہند'' میں اتارا گیا[۳] اور انہیں صنعت[۴] اور زبان[۵] دونوں سکھا کر دنیا میں بھیجا گیا۔ میدان عرفات میں ''عہد الست'' ہوا[۶] اور آدم کی اولاد ''مشرق'' میں ''شام'' (Mesopotamia) میں آباد ہوئی۔[۷] میسوپوٹیمیا دریائے دجلہ اور فرات کے مابین کی زرخیز زمین کو کہتے ہیں جو عراق اور شام میں واقع ہے۔ میسوپوٹیمیا دنیا کی قدیم ترین تہذیب تھی کہ جس سے دیگر تہذیبوں نے جنم لیا۔ اس زمین پر انسانوں نے سب سے پہلے اسی علاقے میں شہر آباد کیے اور پھر یہاں سے دوسرے علاقوں اور براعظموں کی طرف ہجرت کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کو دنیا کی تمام تہذیبوں کا گہوارہ (cradle of cvilizations) قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نبوت اور رسالت کا مرکز یہی علاقہ رہا ہے۔

آدمؑ اور نوحؑ کے مابین دس نسلیں ہیں[۸] جو توحید پر ایمان رکھنے والی تھیں۔[۹] آدم کی اولاد میں پہلی مرتبہ ''شرک'' کا ظہور نوحؑ کے زمانے میں ہوا[۱۰] جبکہ وہ ''شام'' (Mesopotamia) کے علاقے میں آباد تھے۔[۱۱] ''قومِ نوح'' کے شرک' سرکشی اور بغاوت کے نتیجے میں ''طوفانِ نوح'' کے ذریعے نسل انسانی ہلاک ہوئی اور اہل کشتی میں سے صرف نوح علیہ السلام ہی کی نسل آگے جاری ہوئی۔[۱۲] قرآن مجید اور بائبل دونوں کے بیان کے مطابق موجودہ نسل انسانی' نوحؑ کے تین بیٹوں سام' حام اور یافث کی اولاد ہیں۔[۱۳] عرب سام' حبشی حام اور اہل روم یافث کی اولاد ہیں۔[۱۴]

نوحؑ اور ابراہیمؑ کے مابین بھی دس نسلیں ہی ہیں۔[۱۵] ''قومِ نوح'' کی ہلاکت کے بعد ''قوم عاد'' ان کی جانشین بنی۔[۱۶] ''قوم عاد'' کی ہلاکت کے بعد ''قوم ثمود'' ان کی جانشین ٹھہری۔[۱۷] ''قومِ ثمود'' کی ہلاکت

کے بعد ''قومِ ابراہیم''، ''قومِ لوط'' اور ''قومِ شعیب'' ان کی جانشین قرار پائیں۔(۱۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد مرکز نبوت ان ہی کی ذریت میں رکھ دیا گیا۔(۱۹) ابراہیم سے موسیٰ اور موسیٰ سے عیسیٰ علیہم السلام تک ''نبوت اور کتاب'' عام طور پر بنواسحاق کے پاس رہی (۲۰) اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنواسماعیل کو منتقل ہوگئی۔(۲۱) اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے جدید انسان (Modern Age) کی تاریخ کی ابتدا ہوئی۔

آخری اور معاصر دور کا آغاز محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا ہے اور یہی ''دور جدید'' ہے کہ جس کا اختتام ''الساعۃ/الواقعہ/القیامۃ'' پر ہوگا۔ یہ اس دنیا کی ابتداء اور انتہاء ہے۔ پس نظریہ تخلیق کے مطابق سائنسی، انسانی اور عمرانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں ہر وہ نقطہ نظر (world view) کہ جس کی بنیاد ''اصولِ ثلاثہ''، ''توحید''، ''رسالت'' اور ''آخرت'' نہ ہو، ظلمت ہے (۲۲) اور ہر وہ علم کہ جس کا معلوم ''اصولِ ثلاثہ'' کا انکار ہو، جاہلیت ہے۔ (۲۳)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہند کی سرزمین میں نازل فرمایا۔(۲۴) آج بھی سری لنکا کے شہر ''رتنا پورہ'' کے جنوب مشرق میں ۴۰ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی ''سری پادا'' کی چوٹی پر پانچ فٹ چار انچ لمبے اور چھ انچ چوڑے پاؤں کا نشان ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی کو مقامی مسلمان اور عیسائی ''آدم کی چوٹی'' (Adams Peak) کا نام دیتے ہیں اور ان کے ہاں معروف زبانی روایت (oral tradition) کے مطابق آدم جنت سے زمین پر یہاں اتارے گئے تھے۔

بائبل کے بیان کے مطابق خدا نے آدم کو زمین کے مشرق میں ''عدن'' کے مقام پر ایک باغ میں رکھا۔ ''عدن'' سے ایک دریا ''باغ'' کو سیراب کرنے کے لیے نکلا اور چار ندیوں میں تقسیم ہوا۔ ''فیسون'' کی وادی ''حویلہ'' کی سرزمین جبکہ ''جیحون'' کی وادی ''کوش'' کی وادی کو سیراب کرتی تھی۔ تیسری ''دجلہ'' کی وادی اور چوتھی ''فرات'' ہے۔(۲۵) اسی طرح آدم کا بیٹا قائن ''عدن'' کے مشرق میں ''نود'' کے علاقہ میں آباد ہوا اور وہاں اپنے بیٹے ''حنوک'' کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ حنوک سے عیراد، عیراد سے محویا ایل، محویا ایل سے متوسا ایل، متوسا ایل سے لمک پیدا ہوا۔ لمک سے یابل، یوبل اور بلقائن پیدا ہوئے۔ یابل کی اولاد نے خانہ بدوشی اختیار کی، جبکہ یوبل کی اولاد نے آلاتِ موسیقی بانسری وغیرہ ایجاد کی۔ اور بلقائن نے لوہے اور پیتل کے ہتھیار بنائے۔(۲۶)

آدم کی پیدائش اور جنت میں رکھے جانے کا قصہ ہمیں سمیری (Sumerian) تہذیب کی قدیم ترین نظم ''رزمیہ گلگامش'' (Epic of Gilgamesh) میں بھی ملتا ہے۔ یہ نظم ''بابل'' (Babylon) شہر کی کھدائی کے دوران ۱۸۰۰ ق م کے زمانے میں لکھی گئی تختیوں پر ملی ہے۔ ''اترا ہاسس'' (Atra-Hasis) جو کہ ''اکادی'' (Akkadian) تہذیب کے باقیات کی ایک رزمیہ نظم ہے کہ جس کے تقریباً ۱۶۵۰ ق م کے دور کے نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ اس نظم میں بھی آدم کی پیدائش اور طوفان نوح، دونوں قصے موجود ہیں۔ سمیری بادشاہوں کی فہرست میں ''اریدو'' (Eridu) کو پہلے سمیری بادشاہ کا شہر قرار دیا گیا ہے جو کہ عراق میں ''اُور'' (Ur) کے شہر سے ۱۲ کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سمیری تہذیب ہی کے ایک اور قصے ''زیوسدرا'' (Ziusudra) میں

بھی تخلیق اور طوفان کا قصہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس قصے کے مطابق طوفان سے پہلے آباد کیے جانے والے شہروں میں پہلا شہر ''اریدو'' (Eridu) جبکہ دوسرا عراق کا شہر ''بادتبیرا'' (Bad-Tibira) ہے۔ تیسرا ''لارسا'' (Larsa)، چوتھا ''سیپار'' (Sippar) اور پانچواں ''شوروپاک'' (Shuruppak) ہے اور یہ سب شہر عراق میں ہی پاس پاس ہی موجود ہیں۔ ''حکمائے سبعہ لما بین النھرین'' (Mesopotamian Seven Sages) میں پہلے حکیم ''اداپا'' (Adapa) کے قصے میں بھی تخلیق کے واقعے کا ذکر ہے اور اس واقعہ کے مخطوطات (manuscripts) تقریباً ۱۴۰۰ ق م کے زمانے کے ہیں۔

آدم سے سیت، سیت سے انوس، انوس سے قینان، قینان سے محلل ایل، محلل ایل سے یارد، یارد سے حنوک، حنوک سے متوسلح، متوسلح سے لمک اور لمک سے نوح پیدا ہوئے۔[۲۷] ''بائبل'' کے بیان کے مطابق آدم اور نوح (علیہما الصلاۃ والسلام) کے مابین ۱۰۵۶ برس کا فرق ہے۔[۲۸] زبان کا اختلاف پہلی مرتبہ نوح کی اولاد میں اس وقت سامنے آیا جبکہ انہوں نے روئے زمین پر پہلی مرتبہ اینٹوں کو آگ میں پکا کر ''بابل'' کا شہر آباد کرنا چاہا اور اس شہر میں آسمانوں کی بلندیوں کو پہنچنے والا برج بنانے کا ارادہ کیا تاکہ دنیا میں اس کا نام باقی رہے تو خدا نے انہیں اس مقصد سے باز رکھنے کے لیے زمین میں پراگندہ کر دیا اور ان کی زبانوں میں اختلاف ڈال دیا۔[۲۹]

نوح کے بیٹے جو کشتی سے نکلے سام، حام اور یافث تھے اور حام کنعان کا باپ تھا۔ یہی تینوں نوح کے بیٹے تھے اور اِن ہی کی نسل ساری زمین پر پھیلی۔[۳۰] اس ''طوفان'' اور ''کشتی'' کا ذکر ہمیں سمیری (Sumerian) تہذیب کی قدیم ترین نظم ''رزمیہ گلگامش'' (Epic of Gilgamesh) میں بھی ملتا ہے۔ یہ نظم ''بابل'' (Babylon) شہر کی کھدائی کے دوران ۱۸۰۰ ق م کے زمانے میں لکھی گئی تختیوں پر ملی ہے۔

''سام'' کی اولاد میں عیلام، اسور، ارفکسد، لود اور ارام ہیں۔ ''ارام'' کی اولاد میں عوض، حول، جتر اور مس ہیں جبکہ ''ارفکسد'' سے سلح، سلح سے عبر، عبر سے فلج اور یقطان پیدا ہوئے۔ اور ''یقطان'' سے موداد، سلف، حصارماوات، اراخ، ہدورام، اوزال، دقلہ، عوبل، ابی مائیل، سبا، اوفیر، حویلہ اور یوباب پیدا ہوئے۔ ''حام'' کی اولاد میں کوش، مصر، فوط اور کنعان ہیں۔ ''کوش'' کی اولاد میں سبا، حویلہ، سبتہ، رعماہ، سبتیکہ، نمرود ہیں، جبکہ ''مصر'' سے لودی، عنامی، الہامی، نفتوحی، فتروسی، کسلوحی اور کفتوری پیدا ہوئے۔ ''کنعان'' سے صیدا، حت، یبوسی، اموری، جرجاسی، حوی، عرقی، سینی، اروادی، صماری، حماتی ہیں۔ ''رعماہ'' کی اولاد میں سبا اور ددان ہیں۔ ''یافث'' کی اولاد میں جمر، ماجوج، مادی، یاوان، توبل، مسک اور تیراس ہیں۔ ''جمر'' کی اولاد میں اشکناز، ریفت اور تجرمہ جبکہ ''یاوان'' کے بیٹوں میں الیسہ، ترسیس، کتی اور دودانی ہیں۔[۳۱] نوح سے سم، سم سے ارفکسد، ارفکسد سے سلح، سلح سے عبر، عبر سے فلج، فلج سے رعو، رعو سے سروج، سروج سے نحور، نحور سے تارخ اور تارخ سے ابرام، نحور اور حاران پیدا ہوئے۔ اور حاران سے لوط پیدا ہوئے۔[۳۲] بائبل کے بیان کے مطابق نوح سے ابراہیم تک ۸۹۰ برس کا فرق ہے۔[۳۳]

وحی کے بیان کے مطابق یہ دنیا میں انسان کے آنے اور اس کی ابتداء کی تاریخ ہے کہ جسے مذہب کے علاوہ علم تاریخ، علم آثار اور علم الانسان جیسے عمرانی علوم کے شواہد کی بھی تصدیق حاصل ہے۔ اس کے برعکس ارتقاء کا

نظریہ ایک دوسری ہی کہانی بیان کرتا ہے' جس کی تصدیق کے لیے عمرانی اور سائنسی علوم کو باقاعدہ ایک مہم کے تحت جھوٹ کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے کہ جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ کے تعارف کے مصادر اور مآخذ

اللہ عزوجل کے وجود کے تعارف کا سب سے بڑا مصدر اور ماخذ وحی ہے۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں تو یہ وحی مکمل طور محفوظ نہ رہ سکی البتہ سابقہ آسمانی کتابوں کے بعض بیانات کی تصدیق آج بھی کتاب وسنت سے ہمیں حاصل ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ لفظ میں تحریف نہیں ہوئی بلکہ بعض مقامات پر تحریف ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سابقہ آسمانی کتابوں سے بیان کرنے کی اجازت دی جب تک کہ ان کا بیان کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔[۳۴] پس اگر سابقہ آسمانی کتب کے کسی بیان کی تصدیق کتاب وسنت سے ہو رہی ہو تو اسے آسمانی وحی قرار دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس بارے کسی کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے۔

اس وقت ہمارے پاس خدا کے وجود کے بارے سب سے مستند ترین مصدر کتاب وسنت ہیں۔ کتاب وسنت کے موضوعات کئی ایک ہیں کہ جن میں عقائد' قانون اور اخلاق وغیرہ شامل ہیں' لیکن کتاب وسنت میں اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں جو نصوص وارد ہوئی ہیں' وہ اللہ کی ذات کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ اور بنیادی ترین مصدر ہیں۔ خدا کی ذات کا ہر تعارف' چاہے اس کا مصدر فلسفہ ہو یا کلام' کشف ہو یا وجدان' فلاسفی آف سائنس ہو یا فلاسفی آف ریلیجن' اس وقت تک لغو' بے کار اور ناقابل قبول ہے جب تک کہ کتاب وسنت کی نصوص کی صریح اور واضح تصدیق حاصل نہیں کر لیتا۔ اللہ عزوجل کی کتاب وسنت میں وارد جمیع اسماء وصفات کا تعارف تو ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے کہ کتاب وسنت میں صرف اللہ کے جو نام وارد ہوئے ہیں' وہ ۷۰ سے کچھ زائد ہیں اور صفات بھی اسی طرح کثرت سے ہیں۔ پس ہم اجمالی اور اصولی گفتگو کے بعد ان اسماء وصفات میں سے ایک اہم اور بنیادی صفت کو موضوع بنا کر اس کے بارے گفتگو کریں گے تاکہ اسماء وصفات کے رستے اللہ کی ذات کے تعارف کے حوالے سے مسلمان گروہوں میں پیدا ہونے والی مناہج کا تقابلی مطالعہ کر سکیں۔ ذیل میں ہم اس مسئلے کو دس اہم نکات کی صورت میں نکھار کر بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے فلسفیانہ اور کلامی نقطہ ہائے نظر

اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں اس امت میں کئی ایک گروہ پیدا ہوئے۔ اس بارے مسلم علمیات (epistemology) میں دو انتہاؤں نے جنم لیا ہے کہ جنہیں تعطیل اور تشبیہ کہتے ہیں۔ تعطیل یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے اسماء وصفات کا انکار کر دیا جائے اور تشبیہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے اسماء وصفات کی کیفیت بیان کی جائے۔ خیر القرون کے گزرتے ہی اس امت میں دو علمی فتنے پیدا ہوئے' جہمیت اور اعتزال۔ معبد الجھنی (متوفی ۸۰ھ) سے ''جہمیہ'' اور واصل بن عطاء (متوفی ۱۳۱ھ) سے ''معتزلہ'' پیدا ہوئے۔ پھر ان دونوں فرقوں سے ہی بقیہ تمام باطل کلامی فرقوں نے اپنے اصول اخذ کیے ہیں۔ جس شخص نے بھی جہمیہ اور معتزلہ کے اصولوں کا گہرائی میں مطالعہ کیا ہے' وہ یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عرفانی اور وجودی فکر کی بنیاد بھی انہی اصولوں پر قائم

ہے کہ جو جہمیہ اور معتزلہ نے پیش کیے تھے اور جن کا کافی وشافی ردّ اس امت کے بہترین طبقات' فقہاء اور محدثین' نے اپنے زمانے میں کر دکھایا تھا۔

سلف صالحین' ائمہ دین اور محدثین عظام نے ان دو فرقوں کے علمی فتنے کو محسوس کرتے ہوئے ان کے عقلی اور کلامی اصولوں کے رد میں مستقل تصانیف مرتب کیں۔ امام ابوحنیفہ (متوفی ۱۵۰ھ) نے الفقه الاكبر' امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) نے الرد على الجهميه والزنادقه' امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) نے خلق أفعال العباد' امام ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) نے الاختلاف فی اللفظ والرد على الجهميه والمشبه' امام دارمی (متوفی ۲۸۰ھ) نے الرد على الجهميه' امام ابوبکر الخلال (متوفی ۳۱۱ھ) نے السنة' امام ابن خزیمہ (متوفی ۳۱۱ھ) نے کتاب التوحيد واثبات صفات الرب' امام ابوجعفر الطحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) نے عقيده طحاويه' امام ابوالحسن الاشعری (متوفی ۳۲۴ھ) نے مقالات الاسلاميين اور الابانه عن أصول الديانه' امام ابوبکر الآجری (متوفی ۳۶۰ھ) نے الشريعة' امام ابوبکر الاسماعیلی (متوفی ۳۷۱ھ) نے اعتقاد ائمه الحديث' امام دارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) نے کتاب الصفات' امام ابن ابی شیبہ متوفی (۲۹۷ھ) نے العرش' امام ابن ابی زید القیروانی (متوفی ۳۸۶ھ) نے عقيدة السلف' امام ابن بطہ متوفی (۳۸۷ھ) نے الابانة الكبرى' امام ابن مندہ (متوفی ۳۹۵ھ) نے الرد على الجهميه' امام لالکائی (متوفی ۴۱۸ھ) نے شرح اصول اعتقاد اهل السنة والجماعه' امام بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) نے الاسماء والصفات' امام ابو اسمٰعیل الہروی (متوفی ۴۸۱ھ) نے ذم الكلام واهله' امام ابن ابی یعلیٰ (متوفی ۵۲۶ھ) نے الاعتقاد' امام عبدالغنی المقدسی (متوفی ۶۰۰ھ) نے الاقتصاد فی الاعتقاد' امام ابن قدامہ المقدسی (متوفی ۶۲۰ھ) نے لمعة الاعتقاد' امام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) نے بيان تلبيس الجهميه فی تاسيس بدعهم الكلاميه' امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) نے العلو للعلی الغفار اور امام ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) رحمہم اللہ نے الصواعق المرسلة فی الرد على الجهمية والمعطلة وغیرہ میں وجود باری تعالیٰ کے بارے جہمی اور معتزلی اصولوں کا کافی وشافی نقلی وعقلی رد کیا ہے۔ یہ تمام کتابیں نہ صرف طبع شدہ ہیں بلکہ مکتبہ شاملہ میں بھی موجود ہیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی کتب ہیں جو جہمیت اور اعتزال کی عقلی بنیادوں کے رد میں مرتب کی گئی ہیں۔ توحید اسماء وصفات کے باب میں جن معاصر علماء نے سلف صالحین کے موقف کو نکھار کے ساتھ مختصر انداز میں جمع کرنے کی کوشش کی' ان میں شیخ محمد بن خلیفہ التمیمی رحمہ اللہ کا نام بہت اہم ہے۔

اب جنہوں نے اسماء وصفات کا انکار کیا تو ان کے انکار کے دو درجات ہیں۔ پہلا درجہ فلاسفہ میں سے ملاحدہ' قرامطہ' لاادریہ اور وجودیہ کا ہے۔ فلاسفہ مثلاً ابن سینا (متوفی ۴۲۷ھ) وغیرہ کا موقف یہ ہے کہ وہ اللہ کے لیے نہ تو کسی اسم کا اثبات کرتے ہیں اور نہ ہی کسی صفت کا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر آپ یہ مان لیں گے کہ اللہ عزوجل ''حی'' اور ''علیم'' ہے تو اللہ کے لیے صفت حیات اور صفت علم بھی ماننا پڑے گی۔ اور جب آپ اللہ کے لیے حیات اور علم کی صفت مان لیں گے تو انسان کے پاس بھی حیات اور علم کی صفت ہے' لہٰذا اللہ اور انسان کی صفات میں مشابہت لازم آئے گی۔ پس خالق اور مخلوق میں مشابہت سے بچنے کے لیے اللہ عزوجل کے لیے

اسماء اور صفات کا اثبات نہ کرنا فلاسفہ کا منہج ہے۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ ہم اللہ کے بارے موجود ہونے کا اثبات بھی نہیں کر سکتے کہ انسان بھی موجود ہے۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ بھی موجود ہے تو اس سے انسان اور اللہ میں مشابہت لازم آئے گی۔ فلاسفہ اللہ کے وجود کا تعارف نفی کے ذریعے کرواتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ''علیم'' ماننے سے تو مشابہت لازم آئے گی کہ انسان بھی علم رکھتا ہے لہٰذا یہ کہو کہ اللہ جاہل نہیں ہے۔ اللہ کو ''کلیم'' کہنے سے تو مشابہت لازم آئے گی کہ انسان بھی کلام کرتا ہے تو یہ کہو کہ اللہ گونگا نہیں ہے۔ اللہ کو ''موجود'' کہنے کی بجائے یہ کہو کہ اللہ معدوم نہیں ہے کیونکہ اللہ کو موجود کہنے میں انسان سے مشابہت ہے۔ اللہ کو ''حی'' کہنے کے بجائے یوں کہو کہ وہ میت نہیں ہے کہ حیات تو انسانوں میں بھی ہے۔ ان کے بقول اللہ کا وجود ''وجود مطلق بشرط الاطلاق'' ہے کہ جس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔[۳۵] پس یہ علیم کا معنی جاہل نہیں ہے' حی کا معنی میت نہیں ہے' کلیم کا معنی گونگا نہیں ہے' قدیر کا معنی محتاج نہیں ہے اور موجود کا معنی معدوم نہیں ہے' کرتے ہیں۔ اور ایسا مطلق خدا کہ جس کا نہ کوئی اسم ثابت ہو اور نہ ہی کوئی صفت' صرف ذہن میں ہوسکتا ہے' خارج میں نہیں' جیسا کہ اس پر ہم تفصیلی بحث اس مضمون کی پہلی قسط میں کر چکے ہیں۔ وجودیوں نے وجود باری تعالیٰ کے بارے انہی فلاسفہ سے وجود مطلق کا اصول اخذ کیا ہے کہ جسے ان میں سے بعض نے ''وجود مطلق لا بشرط'' بنا دیا تا کہ تنزل ممکن ہو سکے' لیکن اس وجود کا بھی خارجی وجود نہیں ہوتا۔ پس ان کا خدا ایسا ہے کہ جو صرف ذہن اور خیال میں ہے' اس سے باہر نہیں ہے۔ دوسرا گروہ قرامطہ اور باطنیہ کا ہے۔ قرامطہ کا کہنا ہے کہ نہ تو ہم اللہ عزوجل کے بارے کسی اسم اور صفت کا اثبات کریں گے اور نہ ہی کسی اسم اور صفت کی نفی کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل نہ موجود ہے اور نہ ہی معدوم' نہ عالم ہے اور نہ ہی جاہل' نہ حی ہے اور نہ ہی میت۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہم اللہ کی ذات کے لیے کسی اسم اور صفت کا اثبات کرتے ہیں تو اللہ عزوجل کی موجود سے مشابہت لازم آتی ہے اور جب کسی اسم اور صفت کی اللہ کی ذات سے نفی کرتے ہیں تو اللہ عزوجل کی معدوم سے مشابہت لازم آتی ہے' لہٰذا دونوں کا انکار کر دو۔ پس یہ اللہ کی ذات سے نقیضین کی نفی کرتے ہیں جو کہ عقلاً محال اور ممتنع ہے۔[۳۶] تیسرا گروہ لاادریہ کا ہے کہ جس کا کہنا ہے کہ ہم نہ تو اسماء وصفات کا اثبات کرتے ہیں اور نہ ہی نفی کرتے ہیں بلکہ اس بارے سکوت اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نہ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ خدا معدوم ہے۔ اسی طرح نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا موجود نہیں ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا معدوم نہیں ہے۔ یہ موقف ابو منصور الحلاج (متوفی ۳۰۹ھ) وغیرہ کی طرف منسوب ہے۔[۳۷] یہ ایک طرح سے اللہ کی ذات کے بارے جہالت کا اقرار ہے کہ جو کفر ہی کی ایک صورت ہے۔ اس رویے کو جدید دور میں لاادریت (Agnosticism) کہتے ہیں۔ چوتھا گروہ وجودیہ کا ہے کہ وہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات سے ممیّز نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک خالق کا وجود' مخلوق کے وجود کا غیر نہیں ہے' کیونکہ اس طرح دو وجود ہو جائیں گے جو کہ ان کے نزدیک شرک ہے۔ پس مخلوق کا وجود' وہی ہے جو خالق کا وجود ہے۔ ان کے نزدیک خالق کی صفت کلام اور صفت سماعت' اور مخلوق کی صفت کلام اور صفت سماعت' ایک ہی صفت ہے۔ پس خالق ہی متکلم ہے اور خالق ہی سمیع ہے۔[۳۸] اگر آپ نے دو متکلم

اور دو سمیع مان لیے تو دو وجود ماننے پڑیں گے' کیونکہ صفت کلام اور صفت سماعت' وجود کو متقاضی ہے لہٰذا کلیم بھی وہی اور سمیع بھی وہی۔ یہ ابن عربی' ابن الفارض' ابن سبعین اور التلمسانی وغیرہ کا قول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابن عربی (متوفی ۶۳۸ھ) نے فرعون کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ فرعون اپنے نعرے ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' میں سچا ہے۔[۳۹] شیخ ابن عربی کی یہ بات گہری تھی جو ان کے بعض مخلص متّبعین کو سمجھ نہ آئی تو انہوں نے اس کی عجیب وغریب تاویلیں شروع کر دیں اور یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے شیخ ابن عربی کے فلسفہ کی گہرائی کو نہ پایا تھا۔ پس کسی نے کہا کہ یہ جملہ ان کی کتاب میں الحاق ہے یعنی کسی اور نے یہ جملے داخل کر دیے ہیں' اور کسی نے کہا کہ یہ اعتبار ہے' تفسیر نہیں ہے وغیرہ وغیرہ' حالانکہ ابن عربی کے فلسفہ وجود کے مطابق بات بالکل واضح ہے اور اس سے ملتی جلتی باتیں نہ صرف فصوص الحکم بلکہ فتوحاتِ مکیہ میں بھی بلا مبالغہ سینکڑوں مقامات پر موجود ہیں کہ وجود ایک ہی ہے لہٰذا جمیع صفات بھی اسی وجود ہی کی ہیں بلکہ وجود ہی ہیں۔ ''أنا ربکم الأعلی'' کا نعرہ بھی اسی وجود ہی کا ہے جو کہ حقیقی وجود ہے' وہ اس طرح کہ خالق اپنی مخلوق کی جمیع حادث صفات سے متصف ہے اور مخلوق اپنے خالق کی جمیع قدیم صفات سے متصف ہے' کیونکہ پہلا ظاہر وجود اور دوسرا مظاہر وجود ہیں۔ علاوہ ازیں جب وہ وجود ذاتی کی بات کرتے ہیں تو اسے وجود مطلق قرار دیتے ہیں کہ جس کا نہ کوئی اسم ہے اور نہ ہی کوئی صفت' اور ان کا یہ خدا جیسا کہ ہم تفصیل سے عرض کر چکے' محض ایک ذہنی تصور ہے کہ جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اور جب وہ وجود اسمی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ان کی مراد اشیاء میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔[۴۰] ملاحدہ' قرامطہ اور لاادریہ تو معدوم کی عبادت کرتے ہیں اور وجودیہ اپنی عبادت کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک مظاہر وجود عابد ہے اور ظاہر وجود معبود۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کا معلوم ہونا اور معلوم نہ ہونا دونوں عقلاً اور شرعاً برابر نہیں ہیں۔ حقیقت کے بارے تجرید (abstraction) فلسفیوں اور وجودیوں کا مذہب ہے' جبکہ سلف صالحین' متکلمین' فقہاء اور محدثین کا موقف ہے کہ حقیقت کی تجرید' جہالت ہی کی ایک قسم ہے کہ ذہن تجرید در تجرید کی صلاحیت رکھتا ہے اور تجرید کی انتہا ''رفع نقیضین'' ہے کہ نہ موجود اور نہ ہی معدوم اور یہی جہالت ہے۔ دنیا میں سفیدی (whiteness) صرف ذہن میں موجود ہوتی ہے جبکہ خارج میں سفید (white) ہی موجود ہے۔ خارج میں سفید کے بغیر سفیدی موجود ہی نہیں ہو سکتی' البتہ ذہن اس کی قدرت رکھتا ہے کہ سفید کے بغیر سفیدی کا تصور کر لے لیکن خارج میں سفید ہی موجود ہے نہ کہ مجرد سفیدی۔ پس حیات' ارادہ' علم' کلام' قدرت' سمع اور بصر وغیرہ میں ذہن تجرید کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن ان جمیع صفات کا خارجی وجود' حی' مرید' علیم' کلیم' قدیر' سمیع اور بصیر وغیرہ کے ساتھ ہی ہے کہ ذہن نے خارجی وجود ہی سے یہ تجرید حاصل کی ہے۔ پس نہ تو حقیقت کامل علم میں ہے اور نہ ہی کامل غیاب میں۔ یہی امت کا موقف رہا ہے' سوائے چند ایک فلسفیوں اور وجودیوں کے ایک قلیل گروہ کے۔ اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ توحیدِ ربوبیت عقلی شعور' توحیدِ عبودیت نفسیاتی شعور اور توحیدِ اَسماء وصفات جمالیاتی شعور کی تسکین ہے۔ اور حقیقت کا علم دو طرح سے حاصل ہوتا ہے: ایک یہ کہ حقیقت ہی نے اپنے بارے جو خبر دی ہے' وہ تجربہ

بن جائے‘ یعنی وحی کا علم حال بن جائے‘ یعنی غیب حاضر بن جائے‘ مثلاً کسی عالمِ دین نے علمِ وحی سے ایمانی و عملی دو طرح کی مناسبت پیدا کر لی تو وہ علم خبر سے حال بن گیا۔ یہ طریقہ انبیاء اور ان کے ورثاء علماء کو حاصل ہوا ہے اور حقیقت کو جان لینے کا یہ طریقہ مستقل اور حجت ہے۔ اور دوسرا صوفیاء کا ہے کہ حقیقت پر سے حجابات رفع ہو گئے‘ یہ عارضی ہے اور نبی کے علاوہ حجت نہیں ہے۔ سلف صالحین اور مقتدمین صوفیاء جو کہ سلف صالحین کے طریق کے نسبتاً بہت قریب تھے‘ کے نزدیک وجود ایک حال ہے نہ کہ معنی۔ اور علم اور وجود میں اصل علم ہے نہ کہ وجود۔ اور علم کی حقیقت‘ تقدیر اور حال‘ خشیت ہے۔ اور خشیت‘ عبودیت کا جوہر ہے۔

بہر حال دوسرا درجہ متکلمین کا ہے کہ جن میں جہمیہ‘ معتزلہ‘ کلابیہ‘ اشاعرہ اور ماتریدیہ شامل ہیں۔ جہمیہ اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ میں سے کسی اسم اور صفت کا اثبات نہیں کرتے۔ خدا کے وجود کے تعارف کا طریق کار ان کے ہاں وہی ہے جو کہ ملاحدہ کے حوالے سے ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ یہ خدا کا تعارف نفی کے ذریعے کرواتے ہیں‘ یعنی علیم کا معنی و جاہل نہیں‘ بیان کرتے ہیں۔ پس یہ ’’وجود مطلق بشرط الاطلاق‘‘ کے قائل ہیں کہ جس کا وجود صرف ذہنی ہے نہ کہ خارجی۔[41] معتزلہ‘ امامیہ‘ زیدیہ‘ اباضیہ اور ابن حزم وغیرہ کا موقف بھی ان سے ملتا جلتا ہی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ عام طور پر اسماء کا اثبات کرتے ہیں اور صفات کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ عالم ہے بغیر کسی صفت علم کے۔ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ قدیر ہے بغیر کسی صفت قدرت کے۔ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ کلیم ہے بغیر کسی صفت کلام کے۔ اور ان میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو صفات کا اثبات تو کرتے ہیں لیکن صرف نام کی حد تک‘ جبکہ ان کے معانی کے قائل نہیں ہیں‘ جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے‘ علم کے ساتھ‘ اور اس کا علم اُس کی ذات ہے۔[42] اللہ تعالیٰ قدیر ہے‘ قدرت کے ساتھ‘ اور اس کی قدرت اس کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کلیم ہے‘ کلام کے ساتھ‘ اور اس کا کلام اس کی ذات ہے۔ وجود یہ بھی صفات کو عین ذات قرار دیتے ہیں اور انہوں نے یہ اصول معتزلہ سے ہی لیا ہے۔ معتزلہ کے بقول صفاتِ باری تعالیٰ عین ذات ہیں اور اس کے علاوہ نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صفات‘ اعراض ہیں‘ اور اعراض‘ حوادث ہیں‘ اور حوادث کا اللہ کی ذات کے ساتھ قیام ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو اللہ کی صفت ماننے کی بجائے مخلوق قرار دیا ہے۔ کلابیہ نے صفات باری تعالیٰ کا اثبات کیا ہے‘ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم صرف ان صفات کا اثبات نہیں کریں گے کہ جن کا تعلق مشیت اور قدرت سے ہو۔ حارث المحاسبی‘ ابوالعباس القلانسی‘ ابوالحسن الاشعری‘ ابوالحسن الطبری‘ الباقلانی‘ ابن فورک‘ ابوجعفر السمنانی‘ قاضی ابویعلیٰ اور ابن عقیل رحمہم اللہ وغیرہ نے اسی قول کی اتباع کی ہے۔[43] کلابیہ نے یہ کہا ہے کہ عوارض اور حوادث میں فرق ہے۔ عوارض تو صفات ہیں اور یہ اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہو سکتی ہیں جبکہ حوادث قائم نہیں ہو سکتے کہ وہ افعال اختیاریہ ہیں۔ پس وہ ایسی صفات کو تو مانتے ہیں کہ جو ذاتی ہوں‘ جیسا کہ صفتِ علم وغیرہ‘ لیکن ایسی صفات کو نہیں مانتے کہ جو فعلیہ ہوں‘ جیسا کہ اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ پس اختیاری افعال والی صفاتِ باری تعالیٰ جیسا کہ نزول (اُترنا)‘ اتیان (آنا)‘ رضا (راضی ہونا)‘ غضب (غصے ہونا) اور فرح (خوش ہونا) وغیرہ کے بارے ان کا کہنا یہ ہے کہ یا تو یہ قدیم اور ازلی

صفات ہیں اوران کا تعلق اللہ کی مشیت اور اختیار سے نہیں ہے' یا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ صفاتِ فعلیہ اللہ کی ذات سے جدا ہیں لیکن ان کی اضافت اللہ کی طرف جائز ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے کلیم ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ کلام کرتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ مخاطب کو اپنی بات سنوا دیتا ہے۔ اور اللہ عزوجل کے آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خالق آتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کے مابین حجاب اُٹھ جاتا ہے اور مخلوق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ خالق آیا ہے۔ اور اللہ عزوجل کے عرش پر مستوی ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ عزوجل عرش پر مستوی ہوا بلکہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے عرش کو پیدا کر کے اس طرح اپنے قریب کیا کہ محسوس ہوا کہ اللہ عزوجل عرش پر مستوی ہے۔[۴۴] قرآن مجید میں جن ذاتی صفات کا بیان ہے' جیسا کہ صفت وجہ (چہرہ)' صفت یدین (دو ہاتھ) اور صفت عین (آنکھ) وغیرہ تو ان کی یہ تاویل نہیں کرتے' لیکن احادیث میں موجود ذاتی صفات مثلاً صفت قدم (پاؤں) اور صفت اصابع (انگلیاں) وغیرہ کی عام طور پر یہ تاویل کرتے ہیں۔ متقدمین اشاعرہ کا موقف بھی کلابیہ سے ملتا جلتا ہے' البتہ متاخرین اشاعرہ کا موقف مختلف ہے۔ متاخرین اشاعرہ اور ماتریدیہ نے صرف انہی صفات کو مانا ہے کہ جنہیں عقل قبول کرتی ہے اور بقیہ صفات کی تاویل کی ہے۔ جن صفات کا انہوں نے اقرار کیا ہے' وہ متاخرین اشاعرہ کے نزدیک سات ہیں جبکہ ماتریدیہ کے نزدیک آٹھ ہیں۔ متاخرین اشاعرہ نے جن سات صفات کا اثبات کیا ہے' ان میں حیات' علم' قدرت' ارادہ' سمع' بصر اور کلام شامل ہے جبکہ الباقلانی اور امام الحرمین رحمہما اللہ نے ان میں ''ادراک'' کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ماتریدیہ نے جن آٹھ صفات کا اثبات کیا ہے' ان میں حیات' علم' قدرت' ارادہ' سمع' بصر' کلام اور تکوین شامل ہیں۔[۴۵] ان صفات کو یہ ''صفاتِ معانی'' کا نام دیتے ہیں اور ان کے علاوہ صفات کی تاویل یا تفویض کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے صفت رحمت سے مراد ''رحمت'' نہیں بلکہ ''ارادۂ ثواب'' ہے' یعنی انہوں نے صفت رحمت کو علیحدہ صفت شمار کرنے کی بجائے' اسے صفت ارادہ میں شامل کر لیا کہ اللہ کے مخلوق پر رحم کرنے سے مراد رحم کرنا نہیں بلکہ مخلوق کو ثواب دینے کا ارادہ کرنا ہے۔ اور اللہ عزوجل کے آسمانِ دنیا پر نازل ہونے سے مراد اُس کی رحمت کا نزول ہے' وغیرہ وغیرہ۔

اور جن گروہوں نے تشبیہہ کا رستہ اختیار کیا تو انہوں نے صفات کے اقرار اور اثبات میں غلو کیا ہے۔ تشبیہہ یہ ہے کہ خالق کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیا جائے۔ انہیں ''مشبہ'' بھی کہتے ہیں اور ان میں قدیم شیعہ' غالی صوفیاء اور کرامیہ شامل ہیں۔ وجود باری تعالیٰ کے بارے متقدمین اور متاخرین شیعہ کے موقف میں بہت فرق ہے۔ اگر متقدمین شیعہ نے تجسیم اور تشبیہہ میں غلو کیا تو متاخرین نے تحریف اور تعطیل میں غلو کیا ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ (متوفی ۳۲۴ھ) نے اپنی کتاب ''**مقالات الاسلامیین**'' میں مشبہ کے گروہوں اور ان کے موقف کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے۔ روافض میں سے بعض کا کہنا یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی شکل وصورت ویسی ہی ہے جیسی کہ انسان کی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کا رب نور سے بنا ہوا اور مذکر ہے کہ جس کے ویسے ہی اعضاء ہیں جیسا کہ انسانوں کے اعضاء ہیں' یہاں تک کہ اس کا دل بھی ہے جو حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کا رب جسم ہے کہ جو گوشت' خون' ہڈیوں اور بالوں سے بنا ہوا ہے اور ان کے

رب کے تمام اعضاء ہیں جیسا کہ انسان کے ہیں سوائے داڑھی اور شرم گاہ کے۔(۴۶) امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ نے امامیہ اور روافض کے چھ گروہوں اور ان کے عقائد کا تذکرہ کیا ہے جو مشبہ میں سے ہیں۔(۴۷) دوسرا گروہ غالی صوفیوں کا ہے کہ جنہوں نے اللہ عزوجل کے لیے جسم مانا ہے۔ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل کسی انسان میں حلول کر سکتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں ہی اللہ عزوجل کا دیدار کیا جا سکتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل سے معانقہ کیا جا سکتا ہے اور معانقہ گلے ملنے کو کہتے ہیں۔(۴۸) کرامیہ کا کہنا یہ ہے کہ اللہ عزوجل کا جسم ہے لیکن دوسرے اجسام کی مانند نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل کا جسم ہمیشہ سے ہے اور وہ ہمیشہ سے ساکن تھا' لیکن جب اُس نے مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اُس نے حرکت کی۔ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل عرش میں اس طرح سمایا ہے کہ عرش بڑا ہے۔ اور بعض کا کہنا یہ ہے کہ اللہ عزوجل عرش میں اس طرح سمایا ہے کہ عرش بھر گیا ہے۔ افعال اختیاریہ کے بارے ان کا موقف یہ ہے کہ بالقوۃ ازلی ہیں اور بالفعل حادث ہیں' یعنی اللہ کی صفت کلام بالقوۃ ازلی اور قدیم ہے جبکہ بالفعل حادث ہے۔(۴۹)

(۲) اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے سلف صالحین کا موقف

اسماء وصفات باری تعالیٰ میں سلف صالحین کا موقف یہ ہے کہ وہ نہ تو اسماء وصفات کے معنی کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی تشبیہ بیان کرتے ہیں۔ وہ ظاہری لغوی اور عرفی معنی جاری کرتے ہیں لیکن اس معنی کی کیفیت بیان نہیں کرتے۔ برصغیر کے جید حنفی عالم دین مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس باب میں علماء کے چند مسلک ہیں: ایک مسلکِ تاویل کہ استوا بمعنی استیلا اور ید بمعنی قدرت اور وجہ بمعنیٰ ذات' وعلیٰ ہذا القیاس اور یہی مختار اکثر متاخرین متکلمین کا ہے۔ دوسرا مذہب: تشابہ فی المعنی وفی الکیفیۃ۔ تیسرا مسلک: معلوم المعنیٰ' متشابہ الکیفیہ۔ اور حق ان میں مسلکِ ثالث ہے اور یہی مذہب صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین ومحدثین وفقہا واُصولیین محققین ہے۔''(۵۰)

مولانا پیر کرم شاہ صاحب رحمہ اللہ ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ جس کو میں نے اپنے دو ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ ہیں؟ اَسلاف کا مسلک یہ ہے کہ وہ ان کلمات کی تاویل نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہاں اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں جس طرح آیت میں مذکور ہے۔ لیکن وہ کیسے ہیں' ان کی حقیقت کیا ہے' ہمیں اس کی خبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے۔ اور متاخرین علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کو میں نے ماں باپ کے واسطہ سے پیدا کیا' لیکن آدم کو بلا واسطہ محض اپنی قدرت سے پیدا فرمایا۔ تو یہاں ید کا معنی قدرت ہے اور یہ استعمال لغت عرب میں عام ہے۔''(۵۱)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سلف صالحین کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَمَذْهَبُ سَلَفِ الْأُمَّةِ وَأَئِمَّتِهَا أَنْ يُوصَفَ اللّٰهُ بِمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ وَبِمَا وَصَفَهُ بِهِ رَسُولُهُ ﷺ مِنْ غَيْرِ تَحْرِيفٍ وَلَا تَعْطِيلٍ' وَلَا تَكْيِيفٍ وَلَا تَمْثِيلٍ فَلَا يَجُوزُ نَفْيُ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى الَّتِي وَصَفَ بِهَا نَفْسَهُ؛ وَلَا يَجُوزُ تَمْثِيلُهَا بِصِفَاتِ الْمَخْلُوقِينَ' بَلْ هُوَ سُبْحَانَهُ ﴿**لَيْسَ كَمِثْلِهِ**

شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ لَا فِي ذَاتِهِ وَلَا فِي صِفَاتِهِ وَلَا فِي أَفْعَالِهِ۔ وَقَالَ نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ الخزاعي: مَنْ شَبَّهَ اللّٰهَ بِخَلْقِهِ فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ جَحَدَ مَا وَصَفَ اللّٰهُ بِهِ نَفْسَهُ فَقَدْ كَفَرَ وَلَيْسَ مَا وَصَفَ اللّٰهُ بِهِ نَفْسَهُ وَرَسُولُهُ تَشْبِيهًا۔ وَمَذْهَبُ السَّلَفِ بَيْنَ مَذْهَبَيْنِ وَهُدًى بَيْنَ ضلالتين: إِثْبَاتُ الصِّفَاتِ وَنَفْيُ مُمَاثَلَةِ الْمَخْلُوقَاتِ؛ فَقَوْلُهُ تَعَالَى:(لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ) رَدٌّ عَلَى أَهْلِ التَّشْبِيهِ وَالتَّمْثِيلِ۔ وَقَوْلُهُ: ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ رَدٌّ عَلَى أَهْلِ النَّفْيِ وَالتَّعْطِيلِ فَالْمُمَثِّلُ أَعْشَى وَالْمُعَطِّلُ أَعْمَى: الْمُمَثِّلُ يَعْبُدُ صَنَمًا وَالْمُعَطِّلُ يَعْبُدُ عَدَمًا۔ وَقَدْ اتَّفَقَ جَمِيعُ أَهْلِ الْإِثْبَاتِ عَلَى أَنَّ اللّٰهَ حَيٌّ حَقِيقَةً عَلِيمٌ حَقِيقَةً قَدِيرٌ حَقِيقَةً سَمِيعٌ حَقِيقَةً بَصِيرٌ حَقِيقَةً مُرِيدٌ حَقِيقَةً مُتَكَلِّمٌ حَقِيقَةً؛ حَتَّى الْمُعْتَزِلَةُ النُّفَاةِ لِلصِّفَاتِ قَالُوا: إِنَّ اللّٰهَ مُتَكَلِّمٌ حَقِيقَةً' كَمَا قَالُوا: مَعَ سَائِرِ الْمُسْلِمِينَ۔ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ حَقِيقَةً قَدِيرٌ حَقِيقَةً' بَلْ ذَهَبَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ كَأَبِي الْعَبَّاسِ الناشي إِلَى أَنَّ هَذِهِ الْأَسْمَاءَ حَقِيقَةٌ لِلّٰهِ مَجَازٌ لِلْخَلْقِ۔ وَأَمَّا جُمْهُورُ الْمُعْتَزِلَةِ مَعَ الْمُتَكَلِّمَةِ الصفاتية۔ مِنْ الْأَشْعَرِيَّةِ الْكُلَّابِيَةِ والكَرَّامِيَة والسالمية وَأَتْبَاعِ الْأَئِمَّةِ الْأَرْبَعَةِ مِنْ الْحَنَفِيَّةِ وَالْمَالِكِيَّةِ وَالشَّافِعِيَّةِ وَالْحَنْبَلِيَّةِ وَأَهْلِ الْحَدِيثِ وَالصُّوفِيَّةِ ۔ فَإِنَّهُمْ يَقُولُونَ: إِنَّ هَذِهِ الْأَسْمَاءَ حَقِيقَةٌ لِلْخَالِقِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى' وَإِنْ كَانَتْ تُطْلَقُ عَلَى خَلْقِهِ حَقِيقَةً أَيْضًا۔ وَيَقُولُونَ: إِنَّ لَهُ عِلْمًا حَقِيقَةً وَقُدْرَةً حَقِيقَةً وَسَمْعًا حَقِيقَةً وَبَصَرًا حَقِيقَةً۔ (۵۲)

''سلف صالحین اور ائمہ دین کا موقف یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اللہ عزوجل کی ذات کو جن صفات سے موصوف کیا ہے تو ہم بھی انہی صفات سے اللہ کی ذات کو موصوف کریں اور اس میں کسی قسم کی تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل بیان نہ کریں۔ (۵۳) پس اللہ عزوجل کی ان صفات کی نہ تو نفی جائز ہے کہ جن کے ساتھ اللہ عزوجل نے خود اپنے آپ کو موصوف قرار دیا ہو اور نہ ہی اللہ عزوجل کی ان صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دینا جائز ہے۔ اور اللہ عزوجل ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ اور ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ ہے۔ یعنی اس جیسا کوئی نہیں ہے' نہ تو اس کی ذات میں' نہ ہی اس کی صفات میں' اور نہ ہی اس کے افعال میں۔ اور نعیم بن حماد خزاعی رحمہ اللہ (متوفی ۲۲۸ھ) کا کہنا ہے کہ جس نے اللہ عزوجل کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی تو اس نے کفر کیا اور جس نے اس صفت کا انکار کیا کہ جس کے ساتھ اللہ عزوجل نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے' تو اس نے بھی کفر کیا۔ پس اللہ عزوجل اور رسول ﷺ نے اللہ کی ذات کو جن اوصاف سے موصوف کیا ہے تو ان میں تشبیہ کسی صورت جائز نہیں ہے۔ اور سلف صالحین کا مذہب ان دو انتہاؤں کے مابین ایک معتدل راہ ہے اور دو گمراہیوں کے مابین ہدایت کا رستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی صفات کا اثبات کریں اور مخلوق کے ساتھ ان صفات کی مماثلت کی نفی کریں۔ اللہ عزوجل کے قول ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ میں صفاتِ باری تعالیٰ کے لیے تشبیہ اور تمثیل بیان کرنے والوں کا رد ہے اور اللہ عزوجل کے قول ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ میں صفات کا انکار اور تعطیل کرنے والوں کا رد ہے۔ تمثیل بیان کرنے والے رات کے اندھوں کی مانند ہیں جبکہ صفات کا انکار کرنے والے دن کے بھی اندھے ہیں۔ تمثیل بیان کرنے والے ایسے خدا کی عبادت کرتے ہیں جو بت کی مانند ہے اور صفات کا انکار کرنے

والے ایسے خدا کو پوجتے ہیں جو معدوم ہے۔ صفات کا اثبات کرنے والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ عزوجل حقیقی معنی میں زندہ ہے، حقیقی معنی میں قدرت رکھتا ہے، حقیقی معنی میں سماعت اور بصارت رکھتا ہے، حقیقی معنی میں ارادہ کرتا ہے، حقیقی معنی میں کلام کرتا ہے۔ یہاں تک کہ معتزلہ جو کہ صفات کی نفی کرنے والے ہیں، انہوں نے بھی اللہ عزوجل کے حقیقی معنی میں متکلم، علیم اور قدیر ہونے کا اقرار کیا ہے جیسا کہ بقیہ امت کا موقف ہے۔ اور معتزلہ میں ایک جماعت تو ایسی بھی ہے جیسا کہ ابوالعباس الناشی وغیرہ کہ ان کا کہنا ہے یہ اسماء اللہ عزوجل کے لیے حقیقت جبکہ مخلوق کے لیے مجاز ہیں۔ اور جمہور معتزلہ، اشاعرہ، کلابیہ، کرامیہ، سالمیہ، حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ، اہل الحدیث اور صوفیاء کا موقف یہ ہے کہ تمام اسمائے باری تعالیٰ خالق کے لیے حقیقی معنی رکھتے ہیں اور مخلوق کے لیے بھی حقیقی معنی ہی رکھتے ہیں۔ اور اکثریت کا موقف یہ بھی ہے کہ اللہ کا علم، قدرت، سمع اور بصر بھی حقیقی معنی میں مراد ہے۔''

کتاب وسنت میں موجود اللہ عزوجل کی صفات کی جب تاویل کی جاتی ہے تو انسان ایک ایسے خدا پر ایمان لا رہا ہوتا ہے کہ جو خود اُس کے ذہن کی تخلیق ہو۔ سلف صالحین کتاب وسنت سے اللہ عزوجل کا تصور بناتے ہیں کہ جہاں وہ لے جائے، بس ہمارا خدا وہی ہے۔ اور بعض لوگ پہلے سے اپنے ذہن میں خدا کا ایک تصور رکھتے ہیں کہ وہ ایسا ہوسکتا ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا۔ اور وہ ایسا ہوسکتا ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا' کی بنیاد محض ان کے فلسفیانہ اور کلامی تصورات اور عقلی وذہنی معیارات ہیں۔ پس اہل تاویل کا منہج یہ ہے کہ اگر کتاب وسنت کا خدا ان کے فلسفیانہ تصورات اور عقلی اصولوں کے خلاف ہو تو وہ نصوص کی تاویل کر کے نصوص کو اپنے ذہن کے خدا کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ ہمیں حکم اس خدا پر ایمان لانے کا ہے کہ جو محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا ہے نہ کہ ایسے خدا پر کہ جس کی تشکیل میں انسانی ذہن ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہو۔ وحی کوئی شئے (object) تھوڑی ہے کہ جس کی شرح وبیان میں عقل کو تحکم (authority) کا مقام حاصل ہو، اگرچہ معتزلہ وحی یعنی قرآن مجید کو شئے (object) یعنی مخلوق ہی مانتے ہیں۔ بلاشبہ نصوص کے معانی کی شناخت میں عقل کی اہمیت مسلم ہے، لیکن جب وہ نصوص کو معانی دے رہی ہوتی ہے تو اس وقت وہ اپنا خدا گھڑ رہی ہوتی ہے۔ اور کیا، نصوص کو اپنے معانی دینے میں شامل ہے اور کیا، نصوص کے معانی کی شناخت کا عمل ہے؟ یہ سلف صالحین کے منہج سے طے ہوگا نہ کہ کسی کے دعویٰ سے۔ اور وہ منہج، سلف صالحین نے تحریف، تعطیل، تشبیہ اور تکییف کے اصولوں میں جمع کر دیا ہے کہ یہ چاروں صورتیں نصوص کو اپنے معانی دینے کی ہیں نہ کہ نصوص کے معانی شناخت کرنے کی۔ خدا کو سمجھنے میں عقل کی پوزیشن انفعالی (passive) ہو تو مطلوب ہے اور اگر فعال (active) ہو تو وہ خدا کو سمجھ نہیں رہی بلکہ خدا بنا رہی ہے۔ یہ توحید اسماء وصفات کے باب میں ایک اہم نکتہ ہے۔ اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا خدا وہی ہے کہ جو کتاب وسنت میں بیان ہو چکا ہے، اور جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رحمۃ اللہ علیہم کا ایمان تھا، کہ وہ خیر القرون میں سے تھے۔ پس قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف کروایا گیا ہے، اس کی تاویل نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت کبھی حاصل نہ ہوگی۔ اگر غور کریں تو توحید اسماء وصفات جمالیاتی شعور کی تسکین ہے اور اسماء وصفات کی تاویل اور تفویض کے ذریعے اس شعور کی تسکین اور سیرابی کے جمیع رستے بند کر دیے گئے

ہیں۔[۵۵] اور جمالیاتی شعور کی تسکین مشبہ کے منہج سے نہیں ہوسکتی کہ یہ بھی کوئی جمال ہے کہ اللہ عزوجل کو مخلوق کے مشابہ قرار دے دیا؟ بلکہ سلف صالحین کے منہج سے ہی ممکن ہے کہ جس میں ذات باری تعالیٰ کے حضور اور غیاب، علم اور جہالت کو معلوم المعنی اور مجہول الکیفیہ کے ذریعے جمع کرلیا گیا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ نہ کامل علم میں ہے اور نہ ہی کامل جہالت میں، نہ کمال حضور ہے اور نہ ہی کمال غیاب، اور یہی جمال کا منتہیٰ ہے۔

(۳) اَسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے ائمہ اربعہ کا عقیدہ

اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے بارے ائمہ اربعہ کا موقف وہی ہے جو صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء، محدثین، متقدمین اصولیین اور محققین صوفیاء کا ہے۔ قرآن مجید میں سات مقامات پر اس صفت کا ذکر ہے کہ اللہ عزوجل اپنے عرش پر مستوی ہے۔ اب بعض لوگ اس کی تاویل اس لیے کرتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ مان لیا کہ اللہ عزوجل عرش پر ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا، وہ آئے گا، جبکہ سلف صالحین اس کو ایسے ہی مانتے تھے جیسا کہ یہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ حضرت یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ عزوجل عرش پر کس طرح مستوی ہے؟ تو امام مالکؒ کو یہ سوال سن کر پسینے چھوٹ گئے، انہوں نے اپنا سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر بعد فرمایا:

الِاسْتِوَاءُ غَيْرُ مَجْهُولٍ، وَالْكَيْفُ غَيْرُ مَعْقُولٍ، وَالْإِيمَانُ بِهِ وَاجِبٌ، وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ، وَمَا أَرَاكَ إِلَّا مُبْتَدِعًا، فَأَمَرَ بِهِ أَنْ يَخْرُجَ [۵۶]

''اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اور اس کی کیفیت سمجھ سے بالاتر ہے، اور اس کے عرش پر مستوی ہونے پر ایمان لانا واجب ہے، اور اس بارے مزید سوال کرنا بدعت ہے، اور میرا خیال ہے کہ تو بھی بدعتی ہے۔ پس امام مالکؒ نے اس شخص کے بارے حکم دیا کہ اسے ان کی مجلس سے اٹھا دیا جائے تو اسے ان کی مجلس سے اٹھا دیا گیا۔''

معروف مالکی فقیہہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

أهل السنة مجموعون عَلَى الْإِقْرَارِ بِالصِّفَاتِ الْوَارِدَةِ كُلِّهَا فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ وَالْإِيمَانِ بِهَا وَحَمْلِهَا عَلَى الْحَقِيقَةِ لَا عَلَى الْمَجَازِ إِلَّا أَنَّهُمْ لَا يُكَيِّفُونَ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ وَلَا يَحُدُّونَ فِيهِ صِفَةً مَحْصُورَةً، وَأَمَّا أَهْلُ الْبِدَعِ وَالْجَهْمِيَّةُ وَالْمُعْتَزِلَةُ كُلُّهَا وَالْخَوَارِجُ فَكُلُّهُمْ يُنْكِرُهَا وَلَا يَحْمِلُ شَيْئًا مِنْهَا عَلَى الْحَقِيقَةِ وَيَزْعُمُونَ أَنَّ مَنْ أَقَرَّ بِهَا مُشَبِّهٌ وَهُمْ عِنْدَ مَنْ أَثْبَتَهَا نَافُونَ لِلْمَعْبُودِ وَالْحَقُّ فِيمَا قَالَهُ الْقَائِلُونَ بِمَا نَطَقَ بِهِ كِتَابُ اللَّهِ وَسُنَّةُ رَسُولِهِ وَهُمْ أَئِمَّةُ الْجَمَاعَةِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ [۵۷]

''اہلِ سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو صفاتِ باری تعالیٰ کتاب وسنت میں موجود ہیں تو ان کا اثبات کیا جائے گا، ان پر ایمان لایا جائے گا، اور انہیں حقیقی معنی پر محمول کیا جائے گا، اور ان کا مجازی معنی مراد نہیں لیا جائے گا۔ البتہ اہلِ سنت ان صفات کی کیفیت بیان نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی تحدید کرتے ہیں۔ اور اہلِ بدعت یعنی جہمیہ، معتزلہ اور خوارج وغیرہ ان صفات کا انکار کرتے ہیں اور ان کو حقیقی معنی پر محمول نہیں

کرتے اوران کا خیال یہ ہے کہ جوان صفات سے حقیقی معنی مراد لے تو وہ مُشبّہ ہے۔اوراہل سنت کی رائے میں یہ سارے گروہ معبود برحق کا انکار کرنے والے ہیں۔اوراس مسئلے میں حق رائے وہی ہے جواہل سنت والجماعت کے ائمہ کی ہے کہ کتاب وسنت کی صفات کا اثبات کیا جائے گا۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۵۰ھ) فرماتے ہیں:

وله يد و وجه ونفس كما ذكره اللّٰه تعالىٰ فى القرآن' فما ذكره الله تعالىٰ فى القرآن من ذكر الوجه واليد والنفس فهو له صفات بلا كيف' ولايقال إن يده : قدرته او نعمته' لأن فيه إبطال الصفة وهو قول اهل القدر والاعتزال ولكن يده صفته بلا كيف' وغضبه ورضاه من صفات اللّٰه تعالىٰ بلا كيف (۵۸)

''اللہ عزوجل کے لیے ہاتھ' چہرہ اور نفس ثابت ہے' جیسا کہ اللہ عزوجل نے ان صفات کا قرآن میں اِثبات کیا ہے۔پس اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں اپنے لیے ہاتھ' چہرہ اور نفس کی جوصفات بیان کی ہیں تو وہ بلا کیفیت ہیں۔اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اللہ کے ہاتھ سے مراد اُس کی قدرت ہے یا اُس کی نعمت ہے' کیونکہ اس طرح کے قول سے اللہ کی صفت باطل قرار پاتی ہے اور یہ کام معتزلہ اور قدریہ کرتے ہیں۔لیکن 'ید' اللہ عزوجل کی صفت ہے بلا کیفیت کے۔اوراللہ کا غضب اوراس کی رضا اس کی صفات ہیں بلا کیفیت۔''

مشہور حنفی فقیہ فخر الاسلام امام بزدوی رحمہ اللہ (متوفی ۴۸۲ھ) لکھتے ہیں:

(فهو له صفات بلا كيف) اى اصلها معلوم ووصفها مجهول لنا فلا يبطل الأصل المعلوم بسبب التشابه والعجز عن درك الوصف' رُوى عن احمد بن حنبل رحمه اللّٰه تعالىٰ ان الكيفية مجهول والبحث عنه بدعة (۵۹)

''(پس یہ اللہ کی صفات ہیں بلا کیفیت کے) یعنی ان صفات کا حقیقی اور اصلی معنیٰ معلوم ہے جبکہ کیفیت مجہول ہے۔پس ان صفات کے حقیقی اور اصلی معنی کا انکار اس وجہ سے نہ کیا جائے گا کہ اس سے مخلوق کے ساتھ (صفات میں) تشابہ لازم آتا ہے' اوراس وجہ سے بھی اس حقیقی واَصلی معنی کا انکار نہیں ہوگا کہ اس کی کیفیت کا اِدراک ممکن نہیں ہے۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ صفات کی کیفیت مجہول ہے اوراس کیفیت کے بارے بحث کرنا بدعت ہے۔''

مشہور حنفی فقیہہ شمس الائمہ امام سرخسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۸۳ھ) لکھتے ہیں:

و كذلك الوجه واليد على نص اللّٰه تعالىٰ فى القرآن معلوم و كيفيـة ذلك من المتشابه فلا يبطل به الأصل المعلوم۔والمعتزلـة ـ خذلهم اللّٰه ـ لاشتباه الكيفية عليهم انكروا الأصل فكانوا بإنكارهم صفات اللّٰه تعالىٰ واهل السنة والجماعة ـ نصرهم الله۔ اثبتوا ما هو الأصل المعلوم بالنص وتوقفوا فيما هو المتشابه وهو الكيفية ولم يجوزوا الاشتغال بطلب ذلك (۶۰)

''اس طرح کا معاملہ صفتِ یداور صفتِ وجہ کا بھی ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں قرآن میں بیان کیا ہے تو اُن کا معنی معلوم ہے لیکن ان کی کیفیات متشابہ ہیں۔پس کیفیت کے متشابہ ہونے کی وجہ سے حقیقی واصلی معنیٰ باطل قرار نہیں پائے گا۔جہاں تک معتزلہ کا تعلق ہے' اللہ اُنہیں رسوا کرے' اُنہوں نے صفات کی کیفیت

کے مشتبہ ہو جانے کی وجہ سے ان کے حقیقی معنی کا بھی انکار کر دیا پس وہ اللہ کی صفات کے منکر بن گئے۔ جبکہ اہل سنت والجماعت' اللہ تعالیٰ ان کی مدد و نصرت فرمائے' صفات کی نصوص کے حقیقی و اصلی معنی کا اثبات کرتے ہیں اور ان صفات میں جو چیز متشابہ ہے اس میں توقف کرتے ہیں اور وہ متشابہ چیز ان کی کیفیت ہے اور اس کیفیت کے پیچھے پڑنے کو اہل سنت جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔''

امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کا عقیدہ بھی صفات کے بارے میں یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

القول فی السنة التی انا علیها' ورأیت علیها الذین رأیتُهم' مثل سفیان ومالك وغیرهما : الاقرار بشهادة ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه وان اللّٰه تعالیٰ علی عرشه فی سمائه یقرب من خلقه کیف شاء' وان اللّٰه تعالیٰ وینزل إلی السماء الدنیا کیف شاء (٦١)

''جس طریقہ کار کو میں نے اختیار کیا اور جس منہج پر میں نے امام سفیان ثوری اور امام مالک رحمہما اللہ کو دیکھا ہے' وہ یہ ہے کہ ہم اس کا اقرار کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر آسمان میں ہے اور اپنی مخلوق سے بھی قریب ہوتا ہے' جیسے وہ چاہتا ہے۔ اور آسمانِ دنیا پر وہ نزول فرماتا ہے جیسے چاہتا ہے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۱ھ) کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

نحن نؤمن بأن اللّٰه علی العرش' کیف شاء وکما شاء' بلا حد' ولاصفة یبلغها واصف او یحده احد' فصفات اللّٰه له ومنه' وهو کما وصف نفسه ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (٦٢)

''ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے' جیسے اور جس طرح اس نے چاہا' بغیر کسی حد کے کہ جسے کوئی بیان کرے' اور بغیر کسی کیفیت کے' کہ جسے کوئی بتلائے۔ پس اللہ کی صفات اسی سے ہیں اور اسی کے لیے ہیں۔ اور اللہ عزوجل ایسے ہی ہیں جیسے اُنہوں نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے' اور نگاہیں اللہ عزوجل کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔''

یہ تمام اقوال ائمہ دین سے صحیح اسناد کے ساتھ ثابت ہیں کہ جن کتب کا ہم نے حوالہ بیان کیا ہے' ان میں ان اقوال کی اسناد بھی موجود ہیں' جیسا کہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس باب میں صحیح سند اور بنیادی مصادر کے حوالوں کے ساتھ ائمہ کے اقوال بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور اس کے خلاف جو کچھ ائمہ دین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ ہمارے مطالعہ میں ہے لیکن ہماری تحقیق میں وہ دو حال سے خالی نہیں ہے: یا تو صحیح سند سے ثابت نہیں ہے یا پھر اس میں تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے ابن عقیل رحمہ اللہ کی شاگردی کی وجہ سے صفات میں تاویل کی جو نسبت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف کی ہے تو حنابلہ کے جلیل القدر ائمہ نے اسے علامہ کے اوہام سے زیادہ وقت نہیں دی ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف صفت اتیان (آنا) کی تاویل کی جو نسبت کی گئی ہے تو اس روایت کے بارے حنابلہ میں پانچ اقوال ہیں کہ جن میں سے معروف ترین یہی ہے کہ وہ روایت حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جن کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے تفردات جمہور حنابلہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہیں' جیسا کہ ابوبکر الخلال رحمہ اللہ وغیرہ کا موقف ہے' جبکہ صحیح قول

کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہ قول آزمائش کے زمانے میں خلق قرآن کے مسئلے میں جہمیہ کو الزامی جواب تھا' جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے ہے۔(۶۳)

(۴) سلف صالحین اور ائمہ اربعہ کے عقیدہ کے عقلی و منطقی دلائل

تاویل اور تفویض کا عقیدہ کتاب وسنت کی نصوص کے علاوہ عقل و منطق کے بھی خلاف ہے۔ سلف صالحین اور ائمہ اربعہ ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے لفظ ''ید'' کو اپنے لیے استعمال کیا ہے تو ایک تو اس لفظ میں تاویل یعنی مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اصل حقیقت ہے' یعنی حقیقی معنی مراد ہوگا اور مجازی معنی اس وقت لیا جائے گا جبکہ اس کا کوئی قرینہ ہو۔ یعنی گفتگو اور خطاب کا یہ ایک تسلیم شدہ اُصول ہے کہ کلام میں اصل حقیقت ہوتی ہے' چاہے وہ حقیقتِ لغوی ہو یا عرفی یا شرعی۔ مجازی معنی مراد لینے کے لیے کوئی دلیل چاہیے یعنی کلام میں مجاز مراد لینا دلیل کا متقاضی ہے۔ اگر تو کلام میں مجاز کو اصل مان لیا جائے تو کلام کا معنی کبھی متعین ہو ہی نہیں ہوسکتا' کیونکہ ہر کسی کا مجاز اپنا ہوگا' جیسا کہ اہل تاویل کا اللہ کی صفات کے مجازی معانی بیان کرنے میں کبھی بھی اتفاق نہ ہوسکا۔ جہمیہ' معتزلہ' اشاعرہ اور ماتریدیہ سب صفات کی تاویل کرتے ہیں لیکن ان کی تاویلات بھی باہم مختلف ہوتی ہے اور کسی ایک تاویل پر ان کا اتفاق نہیں ہے' جبکہ دوسری طرف سلف صالحین اور ائمہ اربعہ حقیقی معنی مراد لیتے ہیں لہٰذا ان میں اتفاق ہے کہ حقیقت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے۔

یہ تو تاویل کی بات ہوئی اور رہی تفویض تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کلام مخاطب کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور جو کلام مخاطب کو سمجھ نہ آئے اسے فصیح اور بلیغ کلام نہیں کہتے۔ پس صفات میں تفویض کا عقیدہ مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ یا ﴿بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ یا ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ وغیرہ جیسی قرآنی آیات کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم یہ جواب دیں کہ ان آیات کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہے' ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ اگر کلام کا معنی ہی واضح نہ ہو تو وہ کلام فصیح و بلیغ کیسے کہلائے گا؟ اللہ کی ذات اس سے بہت منزہ ہے کہ ایسا مبہم کلام کرے جو مخاطب کو سمجھ ہی نہ آئے۔ بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝۲﴾ (یوسف) ''بلاشبہ ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم اسے سمجھو۔''

اسی طرح جب اللہ عزوجل نے اپنے لیے ''ید'' کا لفظ استعمال کیا تو اگرچہ اس کی کنہ اور مکمل حقیقت ہمیں معلوم نہ بھی ہو لیکن یہ تو معلوم ہے کہ ''ید'' سے مراد پاؤں' آنکھیں' چہرہ' ذات وغیرہ نہیں ہوتی۔ گویا آپ نے ''ید'' کے معانی سے ایک لمبی چوڑی فہرست کو جب خارج کر دیا تو ''ید'' کا کچھ معنی تو از خود متعین ہوگیا۔ یعنی اگر ''اہل تفویض'' سے یہ کہا جائے کہ کیا صفتِ ید سے مراد صفتِ عین ہوسکتی ہے تو ان کا جواب کیا ہوگا؟ پس ''ید'' کی حقیقت معلوم ہے جبکہ اس حقیقت کی کیفیت معلوم نہیں ہے۔ تفویض دراصل جہالت ہی کا اظہار ہے اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ انبیاء اور صحابہ کی جماعت بھی اللہ کی ذات اور صفات سے جاہل تھی' معاذ اللہ! لہٰذا تفویض کسی صورت معقول منہج نہیں ہے۔ اور رہی سلف صالحین کی طرف تفویض کی نسبت تو یہ درست نہیں ہے

اور محقق قول یہی ہے کہ سلف جس تفویض کے قائل ہیں' وہ کیفیت میں تفویض ہے نہ کہ معنی میں۔ اور اس بارے مستقل تحقیقات موجود ہیں۔

(۵) معنی اور کیفیت میں فرق کی بحث اور تجسیم کا طعن

اہلِ تاویل اور اہلِ تفویض نے یہ جو اعتراض کیا ہے کہ صفات کا حقیقی معنی مراد لینے سے تجسیم لازم آتی ہے تو یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ اہل تاویل کے لیے تو اس اعتراض کا الزامی جواب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کے لیے وجود' قدرت' ارادہ' کلام' سمع' بصر وغیرہ کا اثبات کیا ہے اور اس کا حقیقی معنی مراد لیا ہے۔ پس اہل تاویل جب ان صفات کو حقیقی معنی پر باقی رکھتے ہیں اور ان کی تاویل نہیں کرتے تو یہ اعتراض خود ان کی طرف لوٹ آتا ہے کہ وہ تجسیم کے قائل ہیں یا نہیں؟ کیا صفت کلام کے مان لینے سے منہ اور جبڑوں کے ہونے کا طعن پیدا نہیں کیا جا سکتا؟ یا صفت ارادہ کے لیے دل کے ہونے کا اعتراض پیدا نہیں کیا جا سکتا؟ یا صفت سماعت اور بصارت کے لیے کان اور آنکھیں ہونے کے سوالات پیدا نہیں ہو سکتے؟ اگرچہ ان سوالات کے جواب دینے میں' خاص طور صفت کلام میں' اہل تاویل بہت دور نکل گئے کہ کلام کو ''کلام نفسی'' بنا دیا کہ جو ایک اعتبار سے گونگا پن ہی ہے کہ انسان اپنے نفس میں ہی کلام کرتا رہے' حالانکہ قرآن مجید نے صفت کلام اسے کہا ہے کہ جسے موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے سنا اور محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مکالمہ کیا۔

جہاں تک اہلِ تفویض کا معاملہ ہے تو ان سے سوال یہ ہے کہ وہ اللہ کے وجود (یعنی موجود ہونے) میں بھی تفویض کے قائل ہیں یا نہیں؟ اگر تو وہ وجود میں بھی تفویض کے قائل ہیں تو تشکیک لازم آتی ہے یعنی وجود باری تعالیٰ میں تفویض کا معنی یہ ہوگا کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وجود کا معنی کیا ہے؟ اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ کے وجود یعنی ہونے اور نہ ہونے کا معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دیں۔ اور یہی تشکیک (agnosticism) ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نہ تو اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اقرار کرتے ہیں۔ اگر تو اہل تفویض وجود کا حقیقی معنی مراد لیتے ہیں تو ان پر بھی تجسیم کا اعتراض لازم آتا ہے' کیونکہ وجود تو کسی شے کا ہوتا ہے اور معدوم کا کوئی وجود نہیں ہوتا اور شئے کا تصور لامحالہ آپ کو جسم کی طرف لے جاتا ہے کہ انسانی ذہن کی مجبوری ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں سلف صالحین اور ائمہ اربعہ کے موقف کو اہل تاویل اور اہلِ تفویض نے صحیح طرح سمجھا نہیں ہے۔ سلف صالحین کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ معلوم المعنی اور متشابہ الکیفیہ ہیں یعنی ان کا معنی معلوم ہے جبکہ کیفیت متشابہ ہے۔ اور جب تک اس موقف میں متشابہ الکیفیہ کی قید ہے تو تجسیم لازم نہیں آتی کہ متشابہ الکیفیہ لفظ کے معنی ہی کا دوسرا پہلو ہے۔ پس متشابہ الکیفیہ سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت ایک پہلو سے نامعلوم ہے' جیسا کہ معلوم المعنی سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت ایک پہلو سے معلوم ہے۔ پس سلف صالحین حقیقت کے تمام پہلوؤں سے ادراک کے قائل نہیں ہیں بلکہ ایک پہلو سے ادراک کے قائل ہیں۔ جنہیں سلف صالحین کے موقف میں تجسیم نظر آتی ہو تو وہ متشابہ الکیفیہ کے الفاظ پر ذرا غور کریں تو ان کی غلط فہمی جاتی رہے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ سلف صالحین کے نزدیک صفت قدم کا حقیقی معنی ثابت ہے اور یہی اس کا مرادی معنی ہے۔ قدم اپنے حقیقی معنی میں نص ہے اور اس میں تفویض اس لیے نہیں ہوسکتی کہ صفت قدم سے کم از کم صفتِ ید مراد نہیں ہے۔ پس ایک دوسری صفت مراد نہ ہونے سے صفت قدم کے معنی کی کچھ تو تحدید ہوگئی۔ جب کچھ تحدید ہوگئی تو تفویض نہ رہی۔ پس صفت قدم اپنے حقیقی معنی میں ماسیق الکلام لاجلہ کے مقصود میں ہے' لیکن متشابہ الکیفیہ کی قید کے ساتھ' اور اس پر مزید سوال یا غور وفکر یا وضاحت کرنے کے بدعت ہونے کے فتویٰ کے ساتھ۔

یہ صرف صفات کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ جمیع امور غیبیہ کا بھی ہے۔ جنت کا لفظ جو قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے' اس کا معنی معلوم ہے' لیکن اس کا کوئی کامل مصداق ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یعنی جنت کا معنی باغ ہے لیکن اس کی کیفیت متشابہ ہے۔ پس اگر کوئی یہ کہے کہ جنت سے مراد بازار ہے یا ایئرپورٹ ہے تو یہ تحریف ہے اور درست نہیں ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ جنت کا معنی معلوم نہیں ہے تو یہ تفویض ہے اور یہ بھی درست نہیں ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ جنت کا معنی معلوم ہے لیکن کیفیت متشابہ ہے تو یہ سلف صالحین کا موقف ہے کہ جنت کا معنی معلوم بھی ہے اور نہیں بھی معلوم۔ یعنی جنت کا کل معنی معلوم نہیں ہے کہ وہ کسی آنکھ نے دیکھا نہیں' کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر اس کا خیال نہیں گزرا جبکہ جنت کا اصل معنی معلوم ہے۔ یہی قاعدہ جنات' ملائکہ' روح' جنت' جہنم' میزان وغیرہ کے بارے بھی جاری ہوگا۔ کیا ان سب قرآنی اصطلاحات میں تفویض مراد ہے؟ یا ان کی تاویل ہوگی؟ یا ان کا اصل معنی معلوم ہے اور کیفیت متشابہ ہے؟

اور اگر صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے وارد ہونے والی نصوص میں تاویل کر بھی لی جائے تو مجاز مراد لینے کی صورت میں لفظ سے حقیقت زائل نہیں ہوتی۔ اگر حقیقت زائل ہو جائے تو لفظ قائم نہ رہے گا بلکہ ختم ہو جائے گا کیونکہ لفظ سے حقیقت کو زائل کر کے اس کے مجاز کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ مجاز تو حقیقت کے بعد وجود میں آئے گا۔ اگر لفظ کی حقیقت ہی نہیں ہے تو مجاز کہاں سے درست ہوگا کہ مجاز تو لفظ کو حقیقت سے پھیرنے کا نام ہے۔ پس مجاز مراد لینے کی صورت میں بھی حقیقت باقی ہی رہتی ہے لہٰذا اس کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح ''ید'' کا معنی کسی کو لغت سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ معاشرے میں معروف الفاظ ہیں۔ پس اردو میں ''ید'' کا ترجمہ ''ہاتھ'' کیا جائے گا' جیسا کہ تمام اردو مترجمین نے قرآن مجید کے ترجمہ میں ''ید'' کا معنی ہاتھ ہی بیان کیا ہے اور ہاتھ کا معنی سب اہل لغت جانتے ہیں۔ پس ''ید'' کا جو معنی معروف ہے' اہل زبان اس کو جانتے ہیں اور وہی صفت ید میں بھی مراد ہے' لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ یہ معنی کیفیت میں متشابہ ہے یعنی صفت ید کا مصداق دنیا میں موجود نہیں ہے۔ پس معنی کے اعتبار سے مصداق دنیا میں موجود ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ہم جب کہتے ہیں کہ زید آیا اور گھوڑا آیا تو دونوں کا آنا ثابت ہے اگرچہ دونوں کا آنا ایک جیسا نہیں ہے۔ زید کا چہرہ اور گھوڑے کا چہرہ میں لفظ چہرہ دونوں عبارتوں میں اپنے حقیقی معنی میں ہے اگرچہ چہرے کی نوعیت اور کیفیت میں بہت فرق ہے۔ پس ملائکہ اور جنات بھی آتے ہیں لیکن ان کا آنا انسان کی طرح

ہے بھی اور نہیں بھی۔ پس من جملہ انسان' جن اور فرشتے کا آنا ایک ہی معنی میں ہے لیکن تفصیل مختلف ہے' جس طرح جنت کی شراب' دودھ' شہد اور پانی اصل معنی میں دنیا کی شراب' دودھ' شہد اور پانی کے ساتھ مشترک ہیں جبکہ تفصیل میں مختلف ہیں۔ پس تکنیکی زبان میں اللہ کا ہاتھ اور انسان کا ہاتھ یہ اسمائے متواطئہ ہیں کہ جن کے مسمیات کے مابین قدر مشترک بھی ہے اور مسمیات میں اختلاف یا تضاد بھی ہے۔(۶۴)

پس سلف صالحین کے موقف میں معلوم المعنی کی وجہ سے تفویض نہیں ہے اور متشابہ الکیفیہ ہونے کی وجہ سے تجسیم نہیں ہے۔ یہ کل خلاصہ ہے۔ باقی کسی بھی نظام فکر کے معانی ضروری نہیں کہ پہلی بار ذہن کی گرفت میں آجائیں' کیونکہ بعض اوقات وہ ذہنی سے زیادہ وجودی ہوتے ہیں کہ جنہیں سوچنے سے زیادہ محسوس کرنے کی ضرورت ہوتی ہے' اور عموماً یہی ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ جیسے جیسے مطالعہ بڑھتا جاتا ہے تو ان معانی کی ذہنی اور وجودی کیفیات کھلتی چلتی جاتی ہیں۔ متاخرین اہل علم میں سلفیت کا معیاری ورژن اسے ہی سمجھا جاتا ہے جو ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ بہت بڑا فلسفیانہ دماغ ہے' ان کی بات اتنی سادہ نہیں ہوتی کہ جتنی ان کے ناقدین بلکہ ان کے پیروکار بھی سمجھتے ہیں۔ اور ان سے **مجموع الفتاوی' منهاج السنة النبوية' بيان تلبيس الجهمية' الجواب الصحيح در تعارض العقل والنقل' الرد على المنطقيين** وغیرہ میں عقل و نقل کو استعمال کرتے ہوئے جس طرح توحید اسماء وصفات کا اثبات ثابت ہے' وہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ اور ابن بطوطہ (متوفی ۷۷۹ھ) کا یہ بیان کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صفت نزول کی کیفیت منبر سے اتر کر بیان کی' امام صاحب رحمہ اللہ پر جھوٹ' بہتان اور کذب ہے کہ جس کے انکار کے لیے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اس باب میں امام صاحب رحمہ اللہ کی ہر دوسری عبارت کیفیت کے بیان کے رد میں ہے۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر مستقل مقالات بھی موجود ہیں کہ ابن بطوطہ نے جس سال دمشق کا سفر کیا' اس سال امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیل میں قید تھے۔(۶۵)

(جاری ہے)

حواشی

(۱) الشوریٰ:۱۳' الاحزاب:۷' آل عمران:۳۳۔۳٤ : المستدرك على الصحيحين' كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ' ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ' دار الكتب العلمية' بيروت' الطبعة الأولى' ۱٤۱۱ھ۔ ۱۹۹۰ء' ج۲' ص ۵۹۵۔

(۲) البقرة: ۳۱۔۳٦۔ المائدة:٤۸۔

(۳) المستدرك على الصحيحين' كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ' ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ' ج۲' ص ۵۹۱۔

(٤) ایضاً: ج۲' ص ۵۹۲۔

(۵) البقرة: ۳۱۔۳۳ : الطبرى' أبو جعفر محمد بن جرير بن يزيد الآملى' جامع البيان عن تأويل آى القرآن۔ تفسير الطبرى' دارهجر للطباعة والنشر والتوزيع والإعلان' الأولى' ۱٤۲۲ھ۔ ۲۰۰۱م' ج۱'

ص ٥١٤۔

(٦) الاعراف: ٢٧١۔١٧٣ : المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، ج٢، ص ٥٩٣۔

(٧) " لَمَّا أَهْبَطَ اللّٰه آدمَ أَهْبَطَه بأرضِ الهِنْد ..... ثم خَرَجَ إلى الشَّام فماتَ بها" (الطبرانی، أبو القاسم سليمان بن أحمد بن أيوب الشامی، المُعْجَمُ الكَبِير للطبرانی، مكتبة ابن تيمية القاهرة، ج١٣،ص٣٤٣۔

(٨) صحيح ابن حبان، كِتَابُ التَّارِيخِ، بَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ ذِكْرُ الْإِخْبَارِ عَمَّا كَانَ بَيْنَ آدَمَ وَنُوحٍ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمَا مِنَ الْقُرُونِ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الأولى، ١٤٠٨هـ ١٩٨٨۔م، ١٤/ ٦٩، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشیء من فقهها وفوائدها ج٦، ص ٣٥٨۔٣٦٠۔

(٩) البقرة: ٢١٣۔ المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، ج٢، ص ٥٩٦۔

(١٠) نوح ٢٣۔٢٤ : صحيح البخاری، كِتَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَابُ ﴿وَدًّا وَلَا سُوَاعًا، وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ﴾، ج٦، ص ١٦٠۔

(١١) هود: ٤٤۔

(١٢) الصافات ٧٥۔٧٧، يونس:٧٣۔٧٤، هود:٤٨، الحديد:٢٦، الفرقان ٣٧:٣٨۔ العنكبوت١٤: نوح کے بیٹے جو کشتی سے نکلے سم، حام اور یافت تھے اور حام کنعان کا باپ تھا۔ یہی تینوں نوح کے بیٹے تھے اور اِن ہی کی نسل ساری زمین پر پھیلی۔ (عہدنامہ قدیم : پیدائش9:18۔19)

(١٣) المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ ﷺ، ج٢،ص٥٩٥۔

(١٤) سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ، بَابٌ فِی فَضْلِ الْعَرَبِ، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابی الحلبی، مصر، الطبعة الثانية، ١٣٩٥هـ ١٩٧٥م، ج٥، ص ٧٢٥۔

(١٥) المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، ج٢، ص٢٨٨ ۔سلسلة الأحاديث الصحيحة وشیء من فقهها وفوائدها ج٧، ص ٨٥٢۔٨٥٥۔

(١٦) الاعراف:٦٥،٦٩۔ الشعراء: ١٢٣، ١٣٠۔ الاحقاف:٢١، الفجر٦۔٨۔

(١٧) الاعراف: ٧٣، ٧٤، العنكبوت٣٨، الشعراء ١٤١۔١٤٩، الفجر٩، الحجر:٨٠۔٨٤۔

(١٨) التوبة:٧٠، الانبياء:٥١۔٥٤، الصافات:٩٧،٩٩۔ العنكبوت:٢٦،٢٩، العنكبوت:٣٦،٣٧، الحجر: ٧١،٧٩، الشعراء: ١٧٦، ١٧٧، الفرقان: ٤٠۔

(١٩) الحديد:٢٦، العنكبوت:٢٧۔ (٢٠) الانعام: ٨٤۔٨٦۔

(٢١) البقرة: ١٢٧، ١٢٩۔ الصف:٦۔ (٢٢) المؤمنون:١١٧، التغابن:٧، الجاثية، ٢٤۔٣٢۔

(٢٣) المائدة: ٥٠۔

(٢٤) إِنَّ أَوَّلَ مَا أَهْبَطَ اللّٰهُ آدَمَ إِلَى أَرْضِ الْهِنْدِ هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ، التعليق من تلخيص الذهبی صحيح (المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ تَوَارِيخِ الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، ذِكْرُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، ج٢، ص ٥٩١۔

(٢٥) عهد نامه قديم :پيدائش٢: ١۔٢٥۔ (٢٦) عهد نامه قديم :پيدائش٤:١۔٢٣۔

(۲۷) عهد نامه قدیم :پیدائش ۵:۱۔۳۲۔ (۲۸) عهد نامه قدیم :پیدائش ۵:۱۔۳۲۔

(۲۹) عهد نامه قدیم :پیدائش ۱۱: ۱۔۱۰۔ (۳۰) عهد نامه قدیم :پیدائش۹: ۱۸۔۱۹۔

(۳۱) عهد نامه قدیم :پیدائش ۱۰: ۱۔۳۲۔ (۳۲) عهد نامه قدیم :پیدائش ۵: ۳۲۔

(۳۳) عهد نامه قدیم :پیدائش ۱۱: ۱۔۳۲۔

(۳٤) وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِی إِسْرَائِیلَ وَلَا حَرَجَ (صحیح البخاری، کِتَابُ أَحَادِیثِ الْأَنْبِیَاءِ، بَابُ مَا ذُکِرَ عَنْ بَنِی إِسْرَائِیلَ، ج٤، ص ۱۷۰)۔

(۳۵) محمد بن خلیفة بن علی التمیمی، مواقف الطوائف من توحید الأسماء والصفات، أضواء السلف، الریاض، المملکة العربیة السعودیة، الطبعة الأولی، ۱٤۲۲هـ/۲۰۰۲م، ص ۷۵۔

(۳٦) ایضاً: ص ۷۵۔ (۳۷) ایضاً: ص ۷٦۔

(۳۸) ایضاً: ص ۷۷۔

(۳۹) ابن عربی، محی الدین، فصوص الحکم، دار الکتاب العربی، بیروت، ص ۲۱۰۔۲۱۱۔

(٤۰) فإن قلت بالتنزیه کنت مقیدا ..... وإن قلت بالتشبیه کنت محددا

وإن قلت بالأمرین کنت مسددا ..... وکنت إماما فی المعارف سیدا

فمن قال بالإشفاع کان مشرکا ..... ومن قال بالإفراد کان موحدا

فإیاك والتشبیه إن کنت ثانیا ..... وإیاك والتنزیه إن کنت مفردا

فما أنت هو بل أنت هو وتراه ..... فی عین الأمور مسرحا ومقیدا

(٤۱) ایضاً: ص ۱۰۲۔ (٤۲) ایضاً: ص ۱۰۲

(٤۳) ایضاً: ص ۱۰۵۔ (٤٤) ایضاً: ص ۱۰۸

(٤۵) ایضاً: ص ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ (٤٦) ایضاً: ص ۱۱۹۔۱۲۰۔

(٤۷) أبو الحسن الأشعری، علی بن إسماعیل بن إسحاق، مقالات الإسلامیین واختلاف المصلین، دار فرانز شتایز، ألمانیا، الطبعة الثالثة، ۱٤۰۰هـ ۱۹۸۰م، ص ۳۱۔

(٤۸) ایضاً: ۱۲۲۔ (٤۹) ایضاً: ۱۳۳۔

(۵۰) سلیم اللّٰه خان، مولانا، ماهنامه وفاق المدارس، نومبر ۲۰۱۰ء، ص ۹۔

(۵۱) پیر کرم شاه، مولانا، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاهور، ج٤، ص ۲۵۲۔

(۵۲) ابن تیمیة، تقی الدین أبو العباس أحمد بن عبد الحلیم الحرانی، مجموع الفتاوی، مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشریف، المدینة النبویة، المملکة العربیة السعودیة، ۱٤۱٦هـ/۱۹۹۵م، ج۵، ص ۱۹۵، ۱۹٦۔

(۵۳) اسماء وصفات کے باب میں یہ کل چار اصول سلف کے مذہب کا خلاصہ ہیں۔ تحریف کسی لفظ کو اس کے اصل معنی سے پھیر دینے کو کہتے ہیں اور تعطیل کسی لفظ کے اصل معنی کو ختم کر دینے کو کہتے ہیں۔ تکییف معنی کی کیفیت بیان کرنے کو کہتے ہیں اور تمثیل کا معنی مثال بیان کرنا ہے۔ سلف صالحین کے موقف کے مطابق ''ید'' کا معنی قدرت بیان کرنا تحریف ہے کہ اصل معنی ہاتھ ہے اور قدرت معنی بیان کر کے اس لفظ کو حقیقی معنی سے مجازی معنی کی طرف پھیر دیا گیا ہے اور تحریف کسی لفظ کو اس کے اصل معنی سے دوسرے معنی کی طرف پھیر دینے کو کہتے ہیں۔ تعطیل سے مراد اصل اور حقیقی معنی کا انکار ہے، چاہے وہ مجاز مراد لینے کے ذریعے ہو، یا تفویض کے ذریعے ہو کہ یہ کہا جائے کہ اس لفظ کا

معنی ہم اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ اور سلف صالحین کے نزدیک یہ دونوں منع ہیں۔ اور تکییف سے مراد یہ ہے کہ ''ید'' سے مراد ہاتھ تو لے لیکن ساتھ میں اس ہاتھ کی کیفیت بیان کرنا شروع کر دے کہ وہ ایسا ہے' ویسا ہے' تو یہ سلف صالحین کے مذہب کے مطابق ممنوع ہے۔ اور تمثیل یہ ہے کہ یہ تو مان لے کہ ''ید'' کا معنی ہاتھ ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی کہے کہ یہ انسانوں جیسا ہاتھ ہے وغیرہ وغیرہ تو یہ بھی سلف صالحین کے مذہب میں منع ہے۔

(٥٤) اسماء اور صفات کے باب میں اختلاف ہے۔ اسمائے باری تعالی میں تو ان سب گروہوں اور سلفیہ کا موقف ایک ہی ہے کہ لفظ میں حقیقت مراد ہوگی نہ کہ مجاز البتہ صفات کے باب میں اختلاف ہو گیا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

(٥٥) توحید اسماء وصفات کے بارے ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل اور صاحبین یعنی قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا عقیدہ یہی ہے کہ وہ اس میں ظاہری لغوی معنی کو جاری کرتے ہیں اور کیفیت بیان نہیں کرتے۔ اس بارے میں ہم نے ماہنامہ محدث مارچ ٢٠١١ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون ''کیا صفات الٰہیہ میں ائمہ اربعہ مفوضہ ہیں؟'' میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

(٥٦) البيهقى' أحمد بن الحسين بن على الخراسانى' (المتوفى٤٥٨: هـ)' الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد على مذهب السلف وأصحاب الحديث' دار الآفاق' بيروت' الطبعة الأولى' ١٤٠١هـ' ص ١١٦۔

(٥٧) ابن عبد البر' أبو عمر يوسف بن عبد الله النمرى القرطبى' التمهيد لما فى الموطأ من المعانى والأسانيد' وزارة عموم الأوقاف والشؤون الإسلامية' المغرب' ١٣٨٧هـ' ج٧' ص ١٤٥۔

(٥٨) الفقه الأكبر مع شرحه :ص٢٧' مكتبة الفرقان' ١٤١٩هـ

(٥٩) اُصولِ بزدوی:ص٣' جاوید پریس' کراچی

(٦٠) اُصول السرخسی :ص١٧٠' دار الكتاب العلميه' بيروت

(٦١) الذهبى'محمد بن أحمد بن عثمان' العلو للعلى الغفار فى إيضاح صحيح الأخبار وسقيمها' مكتبة اضواء السلف' الرياض'الطبعة الأولى' ١٤١٦هـ ١٩٩٥م' ص١٦٥

(٦٢) درء تعارض العقل والنقل:/' دار الكنوز الادبية' الرياض

(٦٣) ابن تيمية' أحمد بن عبد الحليم الحرانى' الاستقامة' جامعة الإمام محمد بن سعود' المدينة المنورة' الطبعة الأولى' ١٤٠٣هـ' ج١' ص ٧٥۔

(٦٤) مجموع الفتاوى' ج٥' ص ٢١٢۔

(٦٥) أحمد بن إبراهيم بن حمد بن محمد بن حمد بن عبد الله بن عيسى (المتوفى١٣٢٧: هـ)' توضيح المقاصد وتصحيح القواعد فى شرح قصيدة الإمام ابن القيم'المكتب الإسلامى' بيروت'الطبعة الثالثة' ١٤٠٦هـ' ج١' ص ٤٩٧۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

تعارف وتبصرہ

(۱)

نام کتاب : روح الامین کی معیّت میں کاروانِ نبوّت

مؤلف : پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد (کراچی)

تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابصار احمد

ملنے کے پتے : (۱) کتاب سرائے' اردو بازار' لاہور (۲) فضلی سنز' اردو بازار کراچی

پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد کا تعلق کراچی سے ہے۔ دینی طور وہ بہت متحرک ہیں۔ دین کے غلبہ واشاعت کے لیے طویل سفر ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے سامنے آڑے نہیں آتا۔ میری ان سے بالمشافہ ملاقات اسلام آباد میں ۲۰۱۵ء کے وسط میں ایک تعلیمی ورکشاپ میں ہوئی' جس کا اہتمام ڈاکٹر محمد امین صاحب (مدیر ماہنامہ البرھان) اوران کے چند ساتھیوں نے کیا' جن میں جناب ملک محمد حسین صاحب بھی شامل تھے۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب مسلسل میرے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔ وہ اسلام کے حرکی تصور سے متاثر ہیں۔ سیرتِ نبویؐ کے مطالعہ کے شائق ہیں۔ ''معالم فی الطریق'' جیسی کتابوں کے مداح ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ سیرت النبی ﷺ کو ایک منفرد انداز میں مرتب کررہے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے پیش نظر سیرت النبی کو دس والیم میں تیار کرنے کا پروگرام ہے۔ دو والیم مکمل ہو چکے ہیں اور تیسرے پر کام جاری ہے۔ پہلے دونوں حصے عمدگی سے زیور طباعت سے آراستہ ہوئے ہیں۔ دونوں ابتدائی حصے عشق ومحبت میں ڈوب کر لکھے گئے ہیں۔ سیرت نگاری کا کام ہی ایسا ہے کہ یہ محبت کے جذبے سے ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔

کتاب کا نام ذرا غیر مانوس ہے۔ عام قاری عنوان کو پڑھ کر ایک مرتبہ توقف کرتا ہے کہ روح الامین تو جبریل امین علیہ السلام ہیں۔ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ ان کا کتاب کے ٹائٹل پر اہتمام سے ذکر ایک نئی بات ہے۔ لیکن تھوڑے سے غور کے بعد قاری اپنے آپ کو اس انداز سے مطمئن کرلے گا کہ آقا علیہ السلام نے جو جدوجہد کی اس میں جبریل علیہ السلام بھی اللہ کے اذن سے مختلف مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ساتھ تھے۔ ملائکہ اللہ کے اذن کے پابند ہیں۔ ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ایک مرتبہ وحی آنے میں وقفہ پیدا ہوگیا۔ پھر جبریل امینؑ جب اللہ کے اذن سے تشریف لائے تو حضرت جبریل نے فرمایا: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾﴾ (مریم) ''اور ہم آپ کے پروردگار

کے حکم کے سوا اتر نہیں سکتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے ہے اور جو ان کے درمیان ہے سب اُسی کا ہے' اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں''۔ اگر کتاب کا عنوان صرف ''کاروانِ نبوت'' ہی رہنے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے' اس سے قاری عنوان کی الجھن سے نکل آئے گا۔ ویسے بھی مختصر عنوان زیادہ جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ عنوان کی حیثیت سائن بورڈ کی ہوتی ہے جو فوری طور پر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

پروفیسر صاحب کی دونوں کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی روشنی میں سیرت کو مدون کرنا چاہتے ہیں۔ بیسویں صدی میں سیرت کو کتابِ الٰہی کی روشنی میں سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اس حوالے سے کئی اہل علم نے اس انداز سے کام کیا ہے۔ قرآن مجید کے ذریعے سے سیرت نگاری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارے میں پوچھا گیا تو ام المومنین سیدہ عائشہ نے جواب دیا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن۔ آپؐ کا اخلاق قرآن تھا۔ یعنی جو قرآن میں بیان ہوا ہے آپؐ نے اس کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ گویا آپؐ مجسم قرآن ہیں۔ ایک قرآن وہ ہے جو کلمات کی شکل میں ہے اور دوسرا عمل کی شکل میں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ (النحل:٦٤) ''اور ہم نے آپؐ پر یہ کتاب اسی لیے نازل کی ہے تاکہ آپؐ ان کے لیے وضاحت کریں جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں''۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں سیرت کو سمجھا جائے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن روانہ کیا جانے لگا تو ان کی طرف سے بھی فیصلہ کے لیے سب سے پہلے قرآن کو حکم بنانے کی بات سامنے آئی۔ سیرت نگاری پر جو پہلے کام ہوا ہے اس سے بھی بھرپور استفادہ کیا جائے۔ اس حوالے سے واقدی (۱۳۰۔۲۰۷ھ) کی ''المغازی'' بہت اہم ہے۔ اس ماخذ کی ضرورت اس وقت زیادہ پڑے گی جب وہ غزوات پر لکھ رہے ہوں گے اور پروفیسر صاحب اس بات سے خود بھی واقف ہیں۔ سیرتِ نبوی سمجھنے کے لیے حدیث نبوی بھی ایک بنیادی ماخذ ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر تسنیم کی دونوں کتابیں ان تینوں ماخذوں یعنی قرآن' حدیث اور کتب سیرت کے حوالے سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن زیادہ قرآن سے مدد لی گئی ہے جو کہ قابل تعریف فعل ہے۔

ان دونوں کتابوں کا حاشیہ معلومات افزا ہے۔ اگرچہ حاشیہ کا فونٹ باریک ہے لیکن بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ بعض امور کی وضاحت میں بہت اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں تفہیم القرآن اور تدبر قرآن سے کافی مدد لی گئی ہے۔ جن کتابوں سے پروفیسر صاحب استفادے کا ذکر کرتے ہیں وہ یقیناً اہم ہیں لیکن جس اسلوب پر وہ لکھ رہے ہیں اور جو بات وہ ثابت کرنے پر زور لگا رہے ہیں اس حوالے سے کئی قابل ذکر کتابیں موجود ہیں جن سے وہ استفادہ کریں تو ان کی فکر میں اور چمک پیدا ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ''منہج انقلابِ نبوی'' لائق مطالعہ ہے۔ اسی طرح سعید رمضان البوطی کی کتاب **فقه السيرة** کو سامنے رکھیں۔ جن خطوط پر پروفیسر صاحب کام کر رہے ہیں اس میں مصطفیٰ السباعی کی کتاب ''**السيرة النبويه دروس وعبر**'' ان کی اچھی راہنمائی کرے گی۔ میری خواہش ہے کہ وہ تیسرے حصے کو فائنل کرنے سے قبل ان تینوں کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیں۔ یہ کتابیں ان کو بنیادی مواد فراہم کریں گی۔ زیر تبصرہ کتاب کے ابواب کے

نام کافی طویل ہیں' اگر ان کو مختصر کیا جائے تو کتاب میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوگی۔ پروفیسر صاحب کی کتابوں کے مطالعہ سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب جس انداز سے سیرت رسول ﷺ مرتب کر رہے ہیں اس میں قرآن کی ترتیب نزولی پر ان کا زیادہ فوکس ہے۔ فی الواقع یہ کام ایک گہرے مطالعہ کا ہے کہ فلاں سورت کے بعد فلاں سورت اور آیات نازل ہوئیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں حتمی طور پر ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کہ فلاں سورت کا زمانۂ نزول فلاں سال ہے۔ ہاں جن سورتوں کے نزول کے بارے میں نمایاں قرائن موجود ہوں ان کے بارے میں کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ زیادہ مشہور تقسیمیں دو ہیں یعنی مکی اور مدنی۔ لیکن قرآن بہر حال ترتیب توقیفی پر مبنی ہے۔ لہٰذا یہی موزوں دکھائی دیتا ہے کہ اس کا مطالعہ collectively کیا جائے۔

ہم جن حالات سے دوچار ہیں اس میں سیرت رسول ہی ہماری راہنمائی کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاں نفاذ اسلام کا طریقہ ایک اہم ایشو ہے۔ اس ایشو کو صرف سیرت مطہرہ ہی حل کر سکتی ہے۔ مشہور قول ہے: **لن یصلح آخر هذه الامّة الا بما صلح به اولها**۔ اس حوالے سے ہمیں سیرت کا تجزیاتی مطالعہ کرنا چاہیے' جیسا کہ جناب پروفیسر صاحب کر رہے ہیں۔ سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تبدیلی کے لیے بالکل ابتدائی مراحل بہت اہم ہیں' جن میں ایمان اور صبر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ پروفیسر تسنیم صاحب بہت عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی کوشش لائق تحسین ہے۔ وہ یہ کام اپنی اخروی زندگی کی کامیابی کے لیے کر رہے ہیں۔ جلد دوم کے صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں: ''مصنف کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام سے جو محبت ہے اس کی خاطر یہ کتاب صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لیے لکھی اور شائع کی گئی ہے''۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ وہ کتاب کی تیاری میں عجلت سے کام نہیں لے رہے۔ وہ جو جو کام کر رہے وہ اللہ کے حبیب ﷺ کا کام ہے' اس میں مواد کا معیار اولین ترجیح ہونی چاہیے' جس کا انہیں خود بھی احساس ہے۔ کتاب کی تیاری بڑے سائنٹیفک انداز میں کی گئی ہے۔ کتاب کے ہر طاق (odd) صفحہ پر باب کا نمبر اور اس کا عنوان مذکور ہے' جبکہ جفت (even) صفحہ پر کتاب کا نام اور جلد نمبر کا ذکر ہے۔ یہ انوکھا سٹائل شاید کتابوں میں کم نظر آئے۔

(۲)

نام کتاب : مصیبتوں سے کیسے نمٹیں؟

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

ضخامت: 550 صفحات رعایتی قیمت: 450 روپے

ملنے کے پتے : دارالنور' اسلام آباد ☆ مکتبہ قدوسیہ' اردو بازار' لاہور

تبصرہ نگار : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ معروف عالم دین اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ وہ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تمام کتابیں معیاری اور حقائق پر مبنی ہیں۔ ان کا طرزِ تحریر منفرد اور مؤثر

ہے‘ اس لیے ان کی کتابیں سلیم الطبع قارئین کے ہاں مقبول اور پسندیدہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ کتاب چار مباحث پر مشتمل ہے۔ مبحث اوّل میں مصیبتوں کے آنے کے اسباب کا تذکرہ ہے۔ نیز یہ کہ مصائب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک آزمائش کے لیے‘ دوسرے غلط کاریوں کی سزا کے طور پر۔ مبحث دوم میں بتایا گیا ہے کہ مصائب کے آنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے۔ نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا‘ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی سے اجتناب‘ دنیاوی سزاؤں کا موجب بننے والے گناہوں سے بچنا‘ اور قرآن کریم سے ہمہ وقت استفادہ کرنا۔ مبحث سوم میں بتایا گیا ہے کہ مصیبتوں کے آنے کے بعد کیا طرزِ عمل ہو۔ خاص طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر مصیبت اذنِ الٰہی سے ہی آتی ہے اور اللہ تعالیٰ رؤوف اور رحیم ہے۔ نیز قضا و قدر پر پختہ ایمان رکھا جائے۔ پھر مسنون دعاؤں کو اختیار کیا جائے۔ مبحث چہارم میں بتایا گیا ہے کہ مصیبتوں کے جانے کے بعد کرنے کے کام کون سے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنا‘ استغفار اور دوسروں کے مصائب دور کرنے میں جدوجہد کرنا۔ مختصر یہ کہ مصنف نے عنوان کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب اس قدر مفید ہے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے‘ کیونکہ مصائب اور صدمات سے مبرا کوئی بھی نہیں۔ ہر طرح کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پسندیدہ اور مفید طرزِ عمل بتایا گیا ہے۔

کتاب کا ٹائٹل شایان شان ہے۔ کاغذ سفید اور اعلیٰ ہے۔ کمپوزنگ معیاری اور غلطیوں سے پاک ہے۔ مضبوط جلد کے ساتھ کتاب دیدہ زیب ہے۔

(۳)

نام مجلّہ : سہ ماہی المظاہر (محرم‘ صفر‘ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ)

مدیر : محمد طفیل

ضخامت: ۹۰ صفحات قیمت فی شمارہ: 50 روپے

ملنے کا پتہ : جامعہ مظاہر العلوم‘ ڈاک خانہ بلی ٹنگ‘ پنڈی روڈ‘ کوہاٹ

’المظاہر‘ دینی علوم کی معروف درس گاہ جامعہ مظاہر العلوم کا ترجمان علمی‘ ادبی مجلّہ ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ نو مضامین پر مشتمل ہے۔ ہر مضمون تحقیق کا شاہکار ہے۔ لکھنے والے اعلیٰ درجے کے عالم ہیں جن کی قدیم اور جدید تقاضوں پر گہری نظر ہے۔ اس شمارے کے تمام مضامین اہم ہیں۔ اسلامی قمری تقویم کی اہمیت کے عنوان پر دلچسپ حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید خالد جامعی کا مضمون ’’سات ہزار زبانوں کی تباہی‘‘ بھی معلومات افزا مقالہ ہے۔

رسالے کے آخر میں تین کتابوں پر تبصرہ بھی شامل ہے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah An-Nisa — cont....

(Ayaat 135-152, inclusive)

Translator's Note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap from the previous issue: verses 127 – 134:

The reader would recall that we had concluded our previous translation and elucidation of Surah An-Nisa (The Women) at verse 134. The underlying message of those 8 verses can be stated as follows:

1- The verses commenced with a reiteration and emphasis by Allah *(SWT)* apropos the importance of His *(SWT)* edicts regarding orphans

in general, and orphan girls in particular, as mentioned at the beginning of this Surah, thus enunciating the importance of the rights of orphans in His *(SWT)* sight. In broad terms, the injunction pronounced in verse 127 of the Surah relates to the treatment of orphans (and all vulnerable members of a community for that matter) with absolute compassion and justice, at all cost.

2- Verses 128 and 129 addressed some of the major jurisprudential matters pertaining to the relationship between husband and wife (or wives), which had been detailed in the previous issue. Some of the general issues regarding the rights of married women viz. their husbands and the rights of husbands viz. their wives are mentioned in remarkable detail in verses 128 and 129 of the Surah as follows:

a) In the Days of Ignorance, a man was free to marry an unlimited number of women, none of whom had basic human rights of any kind, these verses focus in great detail on the rights of women married to a man.

b) Verse 128 states that it was better for the spouses to come to a mutual understanding based on an amalgam of love and compromise so that the wife may remain with the same man with whom she had (assumingly) spent (a significant) part of her life already and so that the sacred institution of family would remain intact.

c) The same verse also alludes to the inherent 'selfishness' present in human nature by default due to Allah's *(SWT)* Will! This 'weakness' is manifested in a number of ways and may lead to a rift in the relationship between spouses.

d) The verse describes, in the context of polygamy, that a wife may experience a sense of 'neglect' from her husband and a lack of fondness as compared to what he has for his other wife (or any of the four wives allowed in Islam), even though she may know and understand the causes which have contributed to her husband's seeming aversion towards her. The verse refers to it as a sort of 'selfishness' on her part.

e) The verse also describes the 'selfishness' of the husband. He may be suppressing his wife unduly and curtailing her marital

rights to an intolerable extent after losing interest in her but the wife per force needs to continue living with him.

f) The tone and the context of the verse clearly indicate that the word 'selfishness' is <u>not</u> being used as a sin or even as a moral depravity. It is rather being employed to describe a basic ingredient built into human nature by Allah's *(SWT)* Will.

g) Verses 128 and 129 also provided guidance for both the spouses to overcome the misunderstanding mentioned above, so that the unit of family may stay intact. In providing an amicable solution to the apparently severe problem, Allah *(SWT)* urges the male (husband), as He *(SWT)* usually does in such matters, to be magnanimous (basically due to the responsibility as head of the family that has been bestowed on him) and treat his aggrieved wife, who has probably spent a considerable number of years with him as his companion, with kindness and grace in spite of the aversion that he has developed for her.

h) Having explained that, Allah *(SWT)* also mentions in verse 129 that it would be rather impossible for a man to ensure complete equality of treatment to two or more wives under all circumstances and in all respects due to the factors elucidated in the translation published in January 2016 issue of Hikmat-e-Qur'an.

i) Being the ultimate enforcer of Justice, Allah *(SWT)* directs that the husband ought not disown his wife altogether but he should try to maintain a good relationship, so that the wife should not feel that she was without a husband and an object suspended in the ether.

j) Finally, Allah *(SWT)* assures the husband in the same verse (129) that provided that he does not inflict any wrong deliberately and tries earnestly to be just in his dealings with the wife; Allah *(SWT)* would pardon whatever minor shortcomings take place in the marital bond between the two, out of His *(SWT)* divine compassion and mercy.

3- Verses 130 through 134 of the Surah provided a 'summary', if you will, of the rights and relationships between spouses as follows:

a) Firstly, people should not entertain the illusion that they have the power to make or mar the destinies of others and that if they were to withdraw their support, people would be left helpless. The fact is that the destinies of all creation rests in the 'Hand' of Allah *(SWT)* alone and He *(SWT)* need not depend on any single person as the sole instrument for helping any of His *(SWT)* creations. The resources of the Lord *(SWT)* of the heavens and the earth are limitless and He *(SWT)* also knows how to use those resources in the most efficient, effective and possible manner.

b) Secondly, the true followers of the Prophet *(SAAW)* ought to heed to the admonition that has been made to them, just as it was made to the followers of the earlier Prophets *(AS)* – Fear Allah *(SWT)* in all of their actions. They are being that in fact by following Allah's *(SWT)* guidance they will secure their own well-being rather than them being the source of any benefit to Allah *(SWT)* and that they can do Allah *(SWT)* no harm by disobeying Him *(SWT)*, just as it did not lay in the power of the followers of the earlier Prophets (*AS)* to cause Allah *(SWT)* any harm. The Lord of the Universe *(SWT)* does not require people's obedience as a precondition to His *(SWT)* divine plans. If they disobey, He *(SWT)* may simply replace them with some other nation, and their dismissal will not diminish the Majesty and Splendour of His *(SWT)* realm in the least.

c) Thirdly, Allah *(SWT)* alone has the power to dispense the obedient people with lavish transient benefits and abiding felicity of this world as well as that of the Hereafter. It all depends on a man's nature and the extent of his ambition regarding the kind of benefit he seeks from Allah *(SWT)*. If a man is infatuated with the fleeting benefits of this world, and is prepared to sacrifice the benefits of the Hereafter in return, then Allah *(SWT)* will grant him only the good of this world and he will have no share in the good of the Hereafter.

d) Verse 134 ends with the assertion that Allah *(SWT)* is the All-Seeing and the All-Hearing. This means that Allah *(SWT)* is fully aware of the actions of His *(SWT)* creatures, and is unlike those negligent sovereigns who are blind in lavishing their favours based on whims alone. Allah *(SWT)* governs the universe with full knowledge and awareness. He *(SWT)* has an 'eye' on the capacities and ambitions of all human beings and knows their qualities and desires, exactly.

Fresh Exposition: verses 135 through 152 of Surah An-Nisa.

Verse 135

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝١٣٥

"Believers! Be upholders of justice, and bearers of witness to truth for the sake of Allah, even though it may either be against yourselves or against your parents and kinsmen, or the rich or the poor: for Allah is more concerned with their well-being than you are. Do not, then, follow your own desires lest you keep away from justice. If you twist or turn away from (the truth), know that Allah is well aware of all that you do."

The verse expresses that it is not enough for believers to uphold definitions of justice made by their own will: they are expected to be the standard-bearers of absolute justice as ordained by Allah *(SWT)*. They are supposed not merely to practise justice in their own dealings but to strive for its triumph. They have to do all within their power to ensure that injustice is eradicated and replaced by equity and justice. A true believer is required to be the pillar supporting the establishment of right and justice.

The testimony of the believers should be solely for the sake of Allah *(SWT)* and their testimony to uphold justice ought not be skewed in favour of their loved ones such as parents, siblings, spouses, friends, other kinsfolk or tribesmen. Nor should their testimony be biased in favour of any of the parties concerned, on the basis of religion, race, gender or any other affiliation. They should not use any opportunity for personal aggrandizement, and they should not seek to please anyone but Allah *(SWT)*.

Note: *Legislation done on the basis of favouring one particular segment of the society such as the recently promulgated 'Protection of Women against Violence Act 2015' by the Punjab Assembly is prohibited according to the cannons of Islam because it does not provide for the fair trial of men. (translator)*

Verse 136

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

"Believers! Have (absolute) faith in Allah and His Messenger and in the Book He has revealed to His Messenger, and in the Book He revealed before. And whoever disbelieves in Allah, in His angels, in His Books, in His Messengers and in the Last Day, has indeed strayed far away."

To ask believers to believe might at first seem strange. The fact is, however, that belief as used here has two meanings:

Firstly, belief denotes that a man has preferred to acknowledge the soundness of true guidance, to distance himself from the fold of those who disbelieve, and to join the camp of the believers.

Secondly, belief denotes faith, a man's believing in the truth with all his heart, with full earnestness and sincerity. It denotes man's sincere determination to mould his way of thinking, his taste and temperament, his likes and dislikes, his conduct and character, his friendship and enmity, and the direction of his efforts and striving, in conformity with the creed which he has resolved to embrace. This verse is addressed to all those who are 'believers' in the first sense of the term, and they are being asked to elevate themselves into the truest of believers, i.e. believers in the second sense.

The term 'Kufr' also has two meanings. One signifies categorical rejection of Allah *(SWT)*, His messengers *(AS)*, His divine Books, the existence of Angels *(AS)* and so on. The other meaning signifies the mere pretence of being a follower of a belief. In this case, either one's heart is not convinced or the conduct is flagrantly opposed to the demands of one's belief. Here the term Kufr conveys both the meanings, and the verse aims at impressing upon people that

whichever kind of Kufr they adopt contrary to the fundamental beliefs of Islam, it will only alienate them from the Truth, and lead them instead to falsehood, and ultimately to their tragic failure and destruction.

Verse 137

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿١٣٧﴾

"Allah will neither forgive nor show the right way to those who believed, and then disbelieved, then believed, and again disbelieved, and thenceforth became ever more intense in their disbelief."

This verse refers to those for whom religion is no more than an object of casual entertainment, a toy with which they like to play as long as it suits their desires and fancies. One wave carries them to the fold of Islam and the next away to that of disbelief. Whenever Islam appears to suit their interests they become Muslims; and when the glamorous visage of the material gains leaps up before their eyes they rush off to 'worship' it. To such people Allah *(SWT)* holds out neither the assurance of forgiveness nor of direction to true guidance. The statement that such people 'became even more intense in their disbelief' refers to those who are not content with not believing themselves, but also try to undermine the faith of others and to persuade them to disbelief. They engage in secret conspiracies as well as overt activities against Islam. They also devote their energies to the struggle aimed at exalting disbelief and degrading the true religion of Allah *(SWT)*. This is a higher degree of disbelief, involving the progressive heaping of crime upon crime. It is obvious that the punishment for this must be greater than that for simple disbelief.

Verse 138

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣٨﴾

"Give tidings of painful chastisement to the hypocrites."

This verse of the Surah identifies the disbelievers mentioned in the previous verse as 'Munafiqun' or hypocrites. Hence, the punishment of hypocrites is a painful torment in this world and particularly in the Hereafter.

Verse 139

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝

"They are who take the unbelievers for their allies in preference to the believers. Do they seek honour from them whereas honour altogether belongs to Allah alone?"

Throughout history, the hypocrites have had a common attribute of aligning themselves with the disbelievers; especially when the latter appeared to possess immense power. On the other hand, the true believers seemed like facing ominous annihilation. The verse explains that the hypocrites are in a false sense of belief that by becoming allies of the disbelievers, they will certainly get 'honour' and 'authority'. While calling this pseudo belief of hypocrites as a farce, the verse says that, "all honour belongs to Allah *(SWT)* alone."

The term *'Izzah'* denotes a position which is extremely exalted and secure. In other words, the term signifies 'inviolable honour and glory' of Allah *(SWT)* alone.

Verse 140

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۝

"Allah has strongly advised you in the Book that when you hear the Signs of Allah being rejected and scoffed at, you will not sit with them until they engage in some other talk, or else you will become like them. Know well, Allah will gather the hypocrites and the unbelievers in Hell – all together."

A person, who professes Islam and yet enjoys the company of those who indulge in blasphemy against Allah *(SWT)*, and who bears with equanimity their scoffing at Allah *(SWT)* and His Messenger *(SAAW)*, is no different from the unbelievers mentioned in this verse. Further explanation of this subject will be furnished in the elucidation of verse 68 of Surah Al-An'am.

Verse 141

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ

عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

"These hypocrites watch you closely: if victory is granted to you by Allah, they will say: 'Were we not with you?' And were the unbelievers to gain the upper hand, they will say: 'Did we not have mastery over you, and yet we protected you from the believers?' It is Allah Who will judge between you on the Day of Resurrection, and He will not allow the unbelievers, in any way, to gain advantage over the believers."

This is typical of the hypocrites of every age. Such people try to avail themselves of all the benefits which they can accrue from a verbal profession of Islam and identification with the Islamic community. They also try to secure the advantages to be obtained by associating with the unbelievers, by assuring them in every possible way about themselves that they are not 'fanatic Muslims', that their association with the Muslims is only nominal.

On the other hand, they never fail to assure the unbelievers that their loyalties and concerns are the same as theirs, that in mental outlook, cultural orientation and taste they are in harmony with them, and that if a decisive conflict between Islam and unbelief were to take place, their weight will certainly be behind the latter.

Allah *(SWT)* warns the hypocrites that He *(SWT)* has complete knowledge of that which is in their hearts and what they pretend to show. He *(SWT)* promises them that on the Day when everyone will be held accountable in the Court of Allah *(SWT)*, the hypocrites most certainly will not be allowed to keep their verbal vows made with the disbelievers and that, the believers will most definitely be victorious over the unbelievers. They will enjoy Allah's *(SWT)* distinctive mercy in Paradise.

Verse 142

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

"Behold, the hypocrites seek to deceive Allah, but it is they who are being deluded by Him. When they rise to Prayer, they rise reluctantly, and only to be seen by men. They remember Allah but little."

The context of this verse makes clear the manner in which the hypocrites tried to deceive Allah *(SWT)* [along with the Prophet *(SAAW)* and the true believers (RAA)].

During the time of the Prophet *(SAAW)* no one, unless he prayed regularly, could be reckoned as belonging to the Islamic community. We know that secular associations consider the absence of any member from their meetings, without a valid excuse, a sign of lacking interest, and that in the event of continued absence, they cancel his membership. ***Note:*** *The order of the illuminati and the Free Masons can be taken as a case in point. (translator)* The early Islamic community did the same with those who absented themselves from congregational prayers. In those days a person's absence from congregational prayers was considered a clear indication of his indifference towards Islam: if he absented himself from them repeatedly he was no longer considered to be a genuine Muslim. In those days, therefore, even the worst amongst the hypocrites had to attend the five daily prayers in the mosque. What distinguished a true believer from the hypocrite was that the former came to the mosque with devotion, fervour and eagerness, came there well before the appointed time for the prayer, and did not rush out of the mosque as soon as the prayer was over. In short, everything about him indicated that his heart was in the prayer and completely devoted to Allah *(SWT)* and His Prophet *(SAAW)*. Whereas the call to the prayer for the hypocrite seemed like the announcement of an unavoidable calamity. When such a person sets off for the mosque, he seemed to do so reluctantly. He walked as if he were dragging the entire weight of his being against his will. No wonder, then, that as soon as the prayer was over, he escaped like a prisoner released from a 'prison'. His entire demeanour testified that the remembrance of Allah *(SWT)* was not what he really had in his heart.

Verse 143

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝

"They dangle between the one and the other (faith and disbelief), and belong neither to these nor to those completely. And he whom Allah lets go astray, for him you can find no way."

This verse divulges an important attribute of the person (diseased in the heart or outright hypocrite) who remained unguided to the Truth despite his acquaintance with the Book of Allah *(SWT)* and with the life of His Prophet *(SAAW)*. He was a person who was so disinclined to the Truth, so infatuated with error and misguided to such an extent that even Allah *(SWT)* let him go forth along the same erroneous direction that he had chosen for himself – a person on whom the door of true guidance had been shut and the way towards further error had been laid open by Allah *(SWT)*. It is virtually beyond the power of human beings to direct such a person to the Truth.

We may be able to grasp this concept if we consider the case of man's livelihood in general. Allah *(SWT)* controls all the sources of man's livelihood. Thus, anyone who receives any portion of livelihood receives it from Allah *(SWT)* alone. At the same time, Allah *(SWT)* grants every man livelihood through the means he has himself sought. If a man seeks his livelihood through lawful means and strives accordingly, Allah *(SWT)* opens the door of honest (Halal) living to him and closes the avenues of dishonest (Haram) earnings in proportion to his earnestness. On the other hand, there is the person who is bent upon fattening himself on dishonest (Haram) earnings and strives accordingly. Allah *(SWT)* permits such a person to continue making an unlawful (Haram) living, and no one has the power to help him secure an honest (Halal) means of living.

The same applies to man's belief and conduct in this life. In this respect too, the ultimate control rests with Allah *(SWT)* alone. No human being can proceed along any path, whether it be good or evil, unless Allah *(SWT)* lets him proceed along it, and bestows upon him the means to do so. However, it is up to man himself to choose his own path, and after he has made the choice, Allah *(SWT)* will let him proceed along it, and will even pave the way for him. If a person really cares about the lawful and unlawful as declared by Allah *(SWT)*, genuinely seeks the truth and earnestly tries to pursue the path charted by Allah *(SWT)* as lawful, Allah *(SWT)* permits him to follow his choice, and even provides the means necessary to proceed along his chosen path. On the other hand, Allah *(SWT)* shuts the door of true guidance on the person who chooses error and strives to

proceed only along wrong paths, and further enables him to follow the path of his choice. It is beyond the power of any human being to prevent such a person from thinking wrongly, acting wrongly and using up his energies in wrong directions. If a man loses the road to his success and is subsequently deprived of true guidance by Allah *(SWT)*, the outcome for that person, inevitably, is grave loss and great torment in the Hereafter.

Verse 144

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝

"Believers! Do not take the unbelievers as your allies in preference to the believers. Do you wish to offer Allah a clear proof of guilt against yourselves?"

In this verse Allah *(SWT)* forbids His *(SWT)* believing servants from taking the disbelievers as friends instead of the believers. This includes being friends and associates of the disbelievers, advising them, being intimate with them and exposing the secrets of the believers to them.

The method of advice is rational as Allah *(SWT)* inquires of the believers that do they want to give Him *(SWT)* clear evidence which may make them worthy of His *(SWT)* punishment and wrath? Logically, one who loves Allah *(SWT)* will love those who worship Allah *(SWT)* with purity. On the contrary, the ones who love worldly desires will love those who are apparently successful in this world.

Verses 145 & 146

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝

"Surely the hypocrites shall be in the lowest depth of the Fire and you shall find none to come to their help,"

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"Except those who repent and mend (their life), hold fast to Allah and purify their religion as in Allah's Sight.: if so, they will be (numbered) with the believers. And soon will Allah grant to the believers a reward of immense value."

Verses 145 and 146 have to be elucidated in unison in order to comprehend the meaning fully.

Verse 145 describes the ultimate abode of the worst of the hypocrites, who not only turn against Islam in toto themselves, but conspire to leave no stone unturned in order to convince true believers into joining them in their perverse ideologies and heinous deeds. About such people, Allah *(SWT)* decrees that they will find their final abode in the bottom of the pit of Hell in the Hereafter – the worst place that one can ever image to be…

Yet verse 146 gives an exception of the rule… Those from the hypocrites who repent honestly, sincerely and genuinely, tracking their way back to the 'straight path', with Allah's *(SWT)* assistance, thus reverting to faith exclusively for Allah *(SWT)*. They will not allow any attachments to strike such deep roots in their heart that they may cease to be capable of sacrificing them for His *(SWT)* sake. Such 'reverts' would then concentrate their loyalties, concerns, affections, and adorations for Allah *(SWT)*. And they will be forgiven for their previous misdeeds and spared the wrath of Allah *(SWT)* that the stone-cold hypocrites would have to endure.

Verse 147

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

"Why should Allah punish you if you are grateful to Him and believe? Allah is All-Appreciative, All-Knowing."

The term 'Shukr' used in this verse denotes an acknowledgement of benefaction and a feeling of gratitude. This verse states that if a person does not behave ungratefully towards Allah *(SWT)* then there is no reason why Allah *(SWT)* should punish him. Punishing people for no reason is not a 'hobby' of Allah *(SWT)*. He *(SWT)* is far exalted than such vile emotions.

The attitude of gratefulness to Allah *(SWT)* consists of acknowledging His *(SWT)* benefaction in one's heart, in confessing it in one's speech and by manifesting it in one's deeds. It is the sum total of these which is termed *shukr*. This attitude requires:

1- That a person should ascribe the benefaction to its Real Source

(SWT), letting none other to share in either the gratitude or the acknowledgement of benevolence;

2- That his heart should be overflowing with love for, and loyalty to, the Benefactor *(SWT)*, and that he should have no attachment with or affection towards His *(SWT)* opponents;

3- That he should obey the Benefactor *(SWT)* and should not use His *(SWT)* bounties contrary to His *(SWT)* directives.

As for Allah *(SWT)*, He *(SWT)* is lenient and prone to overlook man's omissions. On the contrary, He *(SWT)* rewards man manifold for his good deeds.

Verse 148

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

"Allah does not like speaking evil publicly unless one has been wronged. Allah is All-Hearing, All-Knowing."

In this verse, the victim of injustice has been permitted to protest against the perpetrator of injustice, or to go to a court of law to seek redress.

Allah *(SWT)* disapproves of a person who openly declares something that is evil. Actions and words can be hidden as well as exposed to people. For example, when we keep something in our heart only we are aware of it but when a person screams or yells it is known as *jahr*. *Jahr* is to say or do something publically.

The verse again states an exception to the general rule, i.e., Allah *(SWT)* despises the public cursing of a person by someone, unless the one who does so has been oppressed and unjustly hurt. Indeed, Allah *(SWT)* is the All-Seeing and the All-Knowing and He *(SWT)* is certainly aware of the mental and psychological state of mind of the oppressed person when he is publically telling off the perpetrator.

Verse 149

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

"(Even though you have the right to speak evil if you are wronged), if you keep doing good – whether openly or secretly – or at least

pardon the evil (then that is the attribute of Allah). Allah is All-Pardoning and He has all the power to chastise."

This verse embodies a moral directive of very high value to the Muslims. The hypocrites, the Jews and the polytheists were all bent on placing all kinds of obstacles in the way of spreading Islam. They eagerly persecuted the Muslims and used all possible means, however malicious, against them. Such an attitude inevitably created anger and resentment among the true believers. It was in the context of this storm of bitter feelings that Allah *(SWT)* told the Muslims that He *(SWT)* did not consider speaking ill of people as praiseworthy. No doubt the Muslims had been wronged, and if a wronged person speaks out against a wrong-doer, he is quite justified in doing so. Even though this is a person's right, it is more meritorious to continue to do good both in public and in private, and to ignore the misdeeds of others. For one's ideal should be to try to follow Allah's *(SWT)* 'way' as far as possible. Allah *(SWT)* with whom one wants to be close is lenient and forbearing; He provides sustenance even to the worst criminals and seeks to forgive even the most serious offences. In order to become close to Allah *(SWT)*, one ought to be generous in spirit and full of tolerance.

Moreover, this was a strategic move designed to protect the Muslims, who were very few in number back then, from further torture at the hands of the infidels. It also provided a practical example which influenced those disbelievers who had some degree of goodness in their heart to start considering the virtues of a religion that forgave even its worst enemies.

Verse 150

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَيُرِيدُونَ
أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾

"There are those who disbelieve in Allah and His Messengers and seek to differentiate between Allah and His Messengers, and say: 'We believe in some and deny others, and seek to strike a way between the two."

In this verse Allah *(SWT)* identifies those who disbelieve and try to cause a distinction between Him *(SWT)* and His Messengers *(AS)*, such as the Jews and Christians, who differentiate between Allah *(SWT)* and His Messengers *(AS)* regarding faith. They believe in some Prophets *(AS)* and reject others, following their desires, lusts and the practices of their forefathers. They do not follow any proof for such distinction, because there is no such proof. Rather, they want to follow a path based on their lusts and prejudices.

Allah *(SWT)* describes these people as disbelievers in Truth, i.e., the religion of Islam. In fact, the true faith in Allah *(SWT)* implies an unquestioned belief in Allah *(SWT)* and His Messenger *(SAAW)*. Believing in some attributes of faith while rejecting others or accepting the Qur'an but rejecting the Ahadith or the Sunnah is mere hypocrisy or a disbelief.

One of the traits of both the Jews and the Hypocrites as described in the Qur'an is that while they claim to accept Allah *(SWT)* as the Lord of the worlds, they reject the Messenger of Allah *(SAAW)* as His *(SWT)* divinely sent Prophet *(SAAW)*. Allah *(SWT)* rejects their claim to faith outrightly and says that they cannot be believers unless they have faith in the Prophet *(SAAW)* sent by Him *(SWT)* and follow his *(SAAW)* every command in letter and spirit.

The bottom line of this verse is that there is no policy of 'pick and choose' in religion. A true believer accepts the religion *(Deen)* of Allah *(SWT)* exactly as it has been brought to us by the Messenger of Allah *(SAAW)*.

Verse 151

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٥١﴾

"It is they, indeed they, who are, beyond all doubt, unbelievers; and for the unbelievers We have prepared a humiliating punishment."

Insofar as being an unbeliever is concerned, there is no difference between

1. those who believe neither in Allah *(SWT)* nor in the Prophets *(AS)*,

2. those who believe in Allah *(SWT)* but not in the Prophets *(AS)*
3. those who believe in some Prophets *(AS)* but reject others *(AS)*, and
4. Want to devise a middle path by differentiating in the belief in Allah *(SWT)* while at the same time a disbelief in the Messenger of Allah *(SAAW)*

Allah *(SWT)* warns all four categories of people stated above that based on their disbelief, they will be casted in Hellfire, that being their final abode.

Verse 152

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"For those who believe in Allah and His Messengers, and do not differentiate between them, We shall certainly give them their reward. Allah is All-Forgiving, All-Compassionate."

This verse presents us with a mirror image of the people described in the previous verse. Allah *(SWT)* declares that those who acknowledge Him *(SWT)* to be their sole object of worship and their only sovereign, and who commit themselves to follow all the Prophets *(AS)*, will merit reward for their acts in the Hereafter. The loftiness of their reward will depends on the nature and extent of their acts of goodness.

The belief or the lack of belief in Allah (SWT), His Messengers (AS) and following of other requisites of faith are a criterion for selection for Heaven or Hell. The lack of belief in Allah *(SWT)*, His Messengers *(AS)* and other requisites of faith for it to be considered valid will be the prime rudiments for the criterion of selection regarding Heaven and Hell. Apparent good acts of a worldly nature would only be considered once the primary belief is based on true faith.

In a nutshell, Allah *(SWT)* will be lenient and forgiving in judging the conduct of only those who have belief in Him *(SWT)* and the Prophets *(AS)*.

And Allah *(SWT)* Knows Best!

محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے شخصی احوال، سوانح اور گراں قدر علمی، دینی و قرآنی خدمات
کے تذکرہ پر محیط ایک جامع اور مبسوط دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت اور دینی خدمات

محترمہ رافعۃ الجبین

کا ایم ایس علومِ اسلامیہ کا 5 ابواب پر مشتمل تحقیقی مقالہ:

- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی اور ان کا دور
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی، تبلیغی اور تنظیمی خدمات
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدماتِ تفسیر قرآن
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفی اور تالیفی خدمات
- ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے افکار اور عصر حاضر

❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ امپورٹڈ بک پیپر ❁ اعلیٰ معیاری طباعت
❁ صفحات: 320 ❁ قیمت: صرف 250 روپے

شائع کردہ
مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501
Email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
Apr.-Jun. 2016 Vol. 35 No. 2

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللہِ